الرسالہ

Al-Risala

December 1998 • No. 265 • Rs. 9

نزاع پیدا ہونے کے بعد پہلے ہی مرحلہ میں
صلح کرلینا ایسا ہی ہے جیسے سنگین مرض پیدا
ہونے کے بعد فوراً اس کا علاج کرلینا۔

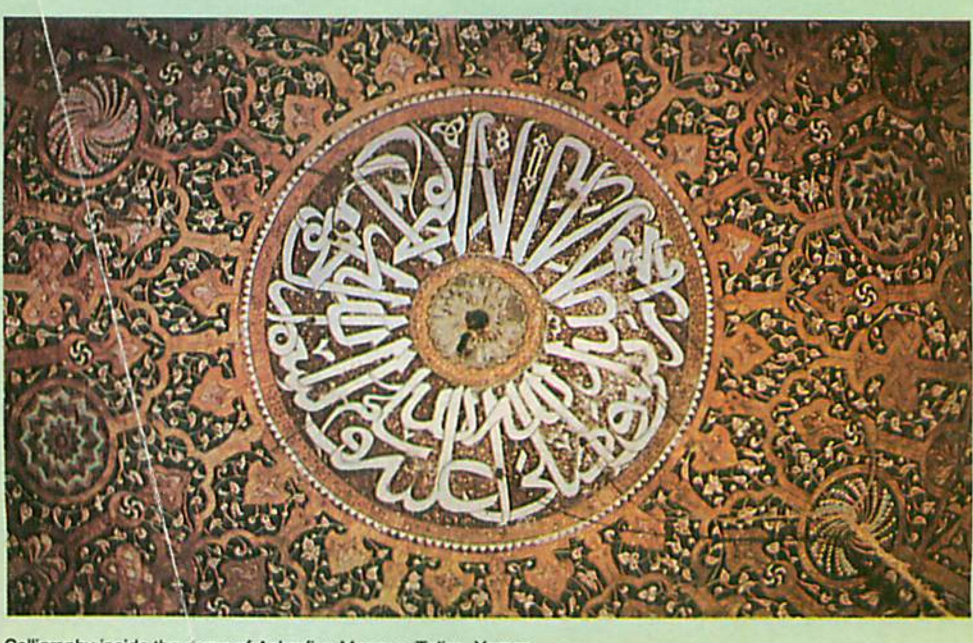

Calligraphy inside the dome of Ashrafiya Mosque, Ta'izz, Yemen

Size: 23.5×16cm,
Pages: 228; Rs. 125

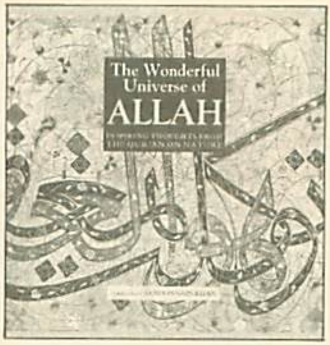

Size: 14×14cm,
Pages: 150; Rs. 95

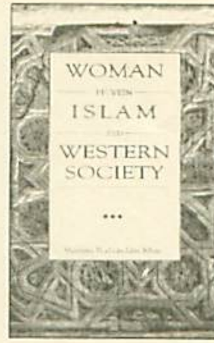

Size: 22×14.5cm,
Pages: 255; Rs. 95

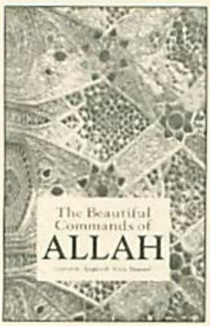

Size: 12.5×19 cm,
Pages: 192; Rs. 125

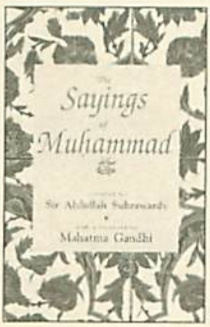

Size: 11.5×15 cm,
Pages: 128; Rs. 75

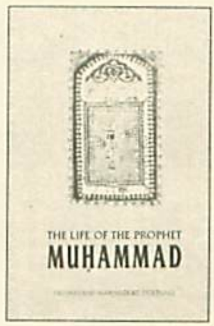

Size: 11.5×15 cm,
Pages: 64; Rs. 75

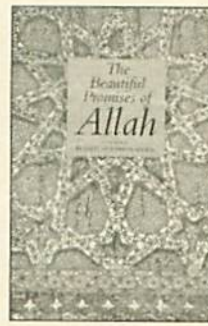

Size: 12.5×19cm,
Pages: 200; Rs. 175

Size: 12.5×19cm,
Pages: 168; Rs. 165

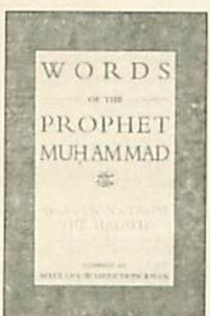

Size: 11.5×15cm,
Pages: 112; Rs. 75

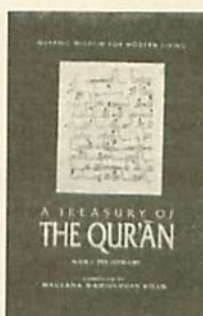

Size: 11.5×15cm,
Pages: 92; Rs. 75

Size: 22×14.5cm,
Pages: 96; Rs. 55

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110 013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333
e-mail: risala.islamic @axcess.net.in

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ

Al-Risāla

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market, Near DVB Office,
New Delhi-110013
Tel. 4611128 Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in
website: http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: Kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

دسمبر ۱۸۹۸، شمارہ ۲۶۵

فہرست	صفحہ

توحید، عدل	۴
پانچ ارکان	۵
مقبول دعا	۶
منافقانہ خوبی	۷
دو برائی	۸
ڈبل معیار	۹
ایک سائنس داں	۱۰
حب عاجلہ	۱۱
مسیح کا کردار	۱۲
تاریخ برائے نصیحت	۱۵
اعتدال کی روش	۱۷
اعتصام بحبل اللہ	۱۸
سفر امریکہ	۲۰
سوال و جواب	۴۷

توحید، عدل

اسلام کی تعلیمات دو بنیادی اصولوں پر قائم ہے ---- توحید اور عدل۔ توحید کا مطلب ہے خدا کو ایک مان کر اپنے آپ کو ہمہ تن اس کے حوالے کر دینا۔ اور عدل کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان معاملات کرتے ہوئے ترازو کی طرح ٹھیک حق کے موافق رویہ اختیار کیا جائے۔ توحید حقیقۃً یہ ہے کہ ایک انسان خدا کو اس طرح دریافت کرے کہ وہ اس کے قلب وروح میں سما جائے۔ خدا اس کی آنکھ کا نور ہو جس سے وہ دیکھے۔ وہ اس کا دماغ ہو جس سے وہ سوچے۔ وہ اس کا مقصود اعلیٰ ہو جو اس کی زندگی کا مرکز و محور بن جائے۔

عدل کے عنوان کے تحت انسان کی جو ذمہ داری ہے اس کی دو صورتیں قرآن سے معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ہر فرد اپنے ذاتی معاملات میں عادل بن جائے۔ اس کا سلوک دوسروں کے ساتھ بالکل ترازو کی مانند ہو جو ہمیشہ ٹھیک تولتا ہے، نہ کم اور نہ زیادہ (اقیموا الوزن بالقسط ولاتخسروا المیزان)

عدل کی دوسری صورت وہ ہے جو صاحب اختیار افراد کے ساتھ مخصوص ہے۔ قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد سے فرمایا کہ اے داؤد، ہم نے تم کو زمین پر بااقتدار بنایا ہے۔ پس تم لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کرو (ص ۲٦)

قرآن کے مطابق، ہر آدمی اپنے حاصل شدہ دائرہ کے اعتبار سے مکلف ہے۔ ایک آدمی کا اختیاری دائرہ محدود ہو تو اس کو اپنے اس محدود دائرہ کے اعتبار سے عادلانہ اصول پر قائم رہنا چاہیئے۔ اس کے مقابلہ میں جس آدمی کا اختیاری دائرہ حکومت واقتدار تک پہنچ جائے اس پر لازم ہو گا کہ وہ اپنے اس توسیعی دائرہ میں اپنے آپ کو عادل اور منصف ثابت کرے۔

پانچ ارکان

حدیث میں آیا ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ عقیدہ توحید، اقامت صلاۃ، روزہ، زکوٰۃ، حج۔ یہ پانچ ارکان صرف مذہبی ارکان نہیں ہیں۔ وہ دین اور دنیا دونوں قسم کی ترقی کی ضمانت ہیں۔ توحید کا عقیدہ ایک اعتبار سے خدا کے ساتھ انسان کے سچے تعلق کا اظہار ہے اور دوسرے اعتبار سے زندگی کی جدوجہد میں اعتماد و یقین کی مستحکم بنیاد عطا کرتا ہے۔ اور یقین واعتماد بلاشبہ موجودہ دنیا میں کامیابی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔

نماز ایک اعتبار سے خدا کی عبادت ہے۔ اس کے ذریعہ بندہ رات دن کے لمحات میں خدا سے ربط قائم کرتا ہے۔ دوسرے اعتبار سے وہ منظم زندگی(disciplined life) کی تربیت ہے اور ڈسپلن بلاشبہ موجودہ دنیا میں کامیابی کی لازمی شرط ہے۔ روزہ ایک اعتبار سے مومن کی سالانہ عبادت ہے۔ دوسرے اعتبار سے وہ صبر وبرداشت کی تربیت ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ صبر وبرداشت کے بغیر موجودہ دنیا میں کوئی بڑا کام کرنا ممکن نہیں۔

زکوٰۃ ایک اعتبار سے بندۂ مومن کی مالی عبادت ہے۔ وہ خدا کی طرف سے ملی ہوئی چیز پر خدا کا شکرانہ ہے۔ دوسرے اعتبار سے وہ اجتماعی زندگی کو نفع بخشی کے اصول پر قائم کرنے کی ایک تدبیر ہے۔ زکوٰۃ اس بات کا سبق ہے کہ لوگ صرف لینے والے نہ بنیں بلکہ دینے والے بھی بنیں۔ اور یہی وہ مزاج ہے جو کسی سماج کو بہتر سماج بنانے والا ہے۔

حج ایک اعتبار سے گویا جامع عبادت ہے۔ اس میں عبادت کی نوعیت کے تمام تجربات اکٹھا کر دیئے گئے ہیں۔ دوسرے اعتبار سے حج عالمی سیاحت کا تجربہ ہے۔ وہ آدمی کے اندر یہ مزاج پیدا کرتا ہے کہ وہ پھیلی ہوئی دنیا کو چل پھر کر دیکھے اور اس سے نصیحت حاصل کرے۔ وہ مقامی شخصیت سے اٹھ کر عالمی شخصیت بن جائے۔

مقبول دعا

دعا ہمیشہ قبول ہوتی ہے، بشرطیکہ وہ سچی دعا ہو۔ کوئی بندہ اگر حقیقی معنوں میں سچی دعا کرے تو دعا اور قبولیت کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہوگا۔ خدا کو غیرت آتی ہے کہ بندہ خدا سے مانگے اور وہ اس کی مانگ کو پورا نہ کرے۔ مگر ایسا صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ مانگنے والے نے صحیح معنی میں مانگنے کا حق ادا کیا ہو۔

دعا الفاظ کی تکرار کا نام نہیں۔ دعا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کچھ الفاظ اپنے اندر طلسماتی اثر رکھتے ہیں۔ اور اگر آدمی ان الفاظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ اپنی زبان سے دہرادے تو اس کے بعد اپنے آپ اس کی دعا "مناجات مقبول" کے ہم معنی بن جائے گی۔

دعا اپنی حقیقت کے اعتبار سے احساس کا اظہار ہے نہ کہ الفاظ کا اظہار۔ بندہ کے دل میں امنڈتی ہوئی کیفیات جب بیتاب ہو کر زبان سے نکل پڑتی ہیں تو اسی کا نام دعا ہوتا ہے۔ حقیقی دعا وہ ہے جس میں آدمی کی پوری شخصیت شامل ہو جائے۔ جو آدمی کے پورے وجود کی نمائندہ بن گئی ہو۔

دعا کی قبولیت کی ایک اہم شرط یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کو دعا کے مطابق ڈھال لے۔ مثلاً ایک شخص شراب پیتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کی صحت خراب ہو گئی ہے۔ اب اگر وہ شخص خدا سے صحت کی دعا کرے تو اس کے ساتھ اس کو شراب نوشی کو ترک کرنے کا عہد بھی کرنا ہوگا۔ اسے اپنی دعا میں یہ کہنا ہوگا کہ خدایا، تو مجھے تندرست کر دے اور اس کے شکرانے میں میں آج ہی سے شراب نوشی کو چھوڑنے کا عہد کرتا ہوں۔ دعا کے ساتھ اس قسم کا عہد گویا اس کی قبولیت کی قیمت ہے۔ جو آدمی یہ قیمت ادا کر دے اس کے لئے دعا کی قبولیت بالکل یقینی ہو جاتی ہے۔

منافقانہ خوبی

قرآن میں منافقین کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ : اور جب تم انھیں دیکھو تو ان کے جسم تم کو اچھے لگتے ہیں۔ اور اگر وہ بات کرتے ہیں تو تم ان کی بات کو سنتے ہو (واذا رایتھم تعجبك احسامهم وان يقولوا تسمع لقولهم)المنٰفقون ٤

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ اس کے مطابق، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک زمانہ آئے گا جب کہ امانت (honesty) لوگوں کے دلوں سے اٹھ جائے گی۔ اس زمانہ میں بظاہر لوگوں کے اندر حسن اخلاق موجود ہو گا مگر وہ منافقانہ ہو گا نہ کہ مخلصانہ۔ یہاں تک کہ ایک شخص کے بارے میں کہا جائے گا کہ وہ کتنا زیادہ عاقل ہے اور وہ کتنا زیادہ ظرف والا ہے اور وہ کتنا زیادہ صبر واستقلال والا ہے۔ حالانکہ اس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان نہ ہو گا۔ (ويقال للرحل ما اعقله وما اظرفه وما احلده ومافى قلبه مثقال حبة خردل من ايمان) فتح البارى ٣٤١/١١

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کردار کی دو قسمیں ہیں ----- مخلصانہ اور منافقانہ۔ جو اخلاقی خوبیاں ایک مخلص انسان کے اندر ہوتی ہیں بظاہر وہی غیر مخلص انسان کے اندر بھی ہو سکتی ہیں۔ مگر اللہ تعالی کو صرف مخلصانہ کردار مطلوب ہے، غیر مخلصانہ کردار کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ مخلصانہ کردار خوف خدا کے تحت پیدا ہوتا ہے اور منافقانہ کردار خوف انسان کے تحت۔ مخلصانہ کردار کا محرک آخرت کا معاملہ ہے اور منافقانہ کردار کا محرک دنیا کا معاملہ۔ مخلصانہ کردار خدا پرستانہ جذبہ کے تحت ابھرتا ہے اور منافقانہ کردار صرف تاجرانہ جذبہ کے تحت۔

دو برائی

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک شرک ایک ناقابل معافی جرم ہے (النساء ۴۸) اسی طرح حدیث میں ہے کہ وہ آدمی جنت میں نہیں جائے گا جس کے اندر ذرہ برابر بھی کبر ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ دو برائیاں سب سے زیادہ بڑی برائیاں ہیں۔ شرک اور کبر (گھمنڈ) شرک خدا کی نسبت سے اور کبر بندوں کی نسبت سے۔ خدا کی نسبت سے انسان کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ خدا کے سوا اور کسی کو اپنا بڑا سمجھے اور اس کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے۔ انسان کے اندر جو عقیدت و محبت کے اعلیٰ جذبات ہیں ان کا واحد مرکز صرف ایک خدا ہے۔ ان جذبات کا مرکز خدا کو بنانا توحید ہے اور اس اعتبار سے کسی اور کو اپنے دل میں جگہ دینا شرک ہے۔

کبر (گھمنڈ) کا تعلق انسان سے ہے۔ انسان کے مقابلہ میں جو اخلاق مطلوب ہے وہ تواضع ہے۔ تواضع کی روش مطلوب انسانی روش ہے اور کبر کی روش غیر مطلوب انسانی روش۔ اللہ تعالی نے ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان فرق رکھا ہے۔ کسی کو کوئی چیز کم ملی ہے اور کوئی چیز زیادہ۔ یہی فرق لوگوں کے اندر برتری کی نفسیات پیدا کر دیتا ہے۔ زیادہ والا کم والے کے مقابلہ میں گھمنڈ کرنے لگتا ہے۔ یہ اللہ کے نزدیک ایک بدترین جرم ہے۔

دنیا میں فرق کا یہ نظام دراصل امتحان کی بنا پر ہے۔ اب یہ چاہیے کہ جسکو کم ملے وہ احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو۔ وہ یہ ثابت کرے کہ دنیا کی کمی اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اصل اہمیت کی بات یہ ہے کہ آخرت میں وہ کمی کا شکار نہ ہو جائے۔ اس طرح جس کو زیادہ حصہ ملا ہے وہ بھی اس لئے کہ وہ اس عطیہ پر شکر کا ثبوت دے۔ وہ بظاہر برتر ہونے کے باوجود متواضع بن کر رہے۔ وہ اپنی فوقیت سے انسان کو فائدہ پہنچائے نہ کہ اس کی بنیاد پر اپنے کو دوسروں سے اونچا سمجھنے لگے۔

ڈبل معیار

قرآن کی سورہ نمبر ۸۳ میں بتایا گیا ہے کہ ---- خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی۔ جو لوگوں سے ناپ کرلیں تو پورا لیں۔ اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا کر دیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ وہ اٹھائے جانے والے ہیں، ایک بڑے دن کے لئے جس دن تمام لوگ خداوند عالم کے سامنے کھڑے ہوں گے (التطفیف ا۔٦)

ان آیتوں میں اس اخلاقی برائی کا ذکر ہے جس کو ڈبل معیار کہا جاسکتا ہے۔ یعنی اپنے آپ کو ایک معیار سے جانچنا اور دوسرے کو اس سے مختلف معیار سے جانچنا۔ جس آدمی کے اندر یہ دوہرا معیار پایا جائے اس کے لئے اس آیت میں نہایت برے انجام کی خبر دی گئی ہے۔

ایسے مزاج کے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کے اندر ایک برائی کو دیکھتے ہیں تو اس کو شرعی یا اخلاقی معیار سے ناپ کر کہتے ہیں کہ دیکھو، یہ شخص کیسا برا ہے کہ ایسا اور ایسا فعل کر رہا ہے۔ مگر جب نشاندہی کی جائے کہ تم خود عین اسی فعل میں مبتلا ہو تو وہ جانچ کے معیار کو بدل دے۔ اب وہ کہے کہ یہ تو دنیا کا رواج ہے، ایسا تو سبھی لوگ کرتے ہیں۔

دوسرے شخص یا دوسری قوم کی برائی کی نشاندہی کرکے اس کو برا بتانا، اور خود اپنے اندر یا اپنی قوم کے اندر اسی قسم کی برائی پائی جائے تو کوئی نہ کوئی وجہ بتا کر اس کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرنا، یہ دہرا معیار ہے۔ اور جو لوگ دہرا معیار کی برائی میں مبتلا ہوں وہ خدا کی نظر میں بدترین مجرم ہیں۔ ایسے لوگ خدا کے یہاں سخت سزا کے مستحق قرار پائیں گے۔

ایک سائنس داں

تھامس الوا ایڈیسن (۱۸۴۷ـ۱۹۳۱) مشہور امریکی سائنس داں ہے۔ بچپن میں اس کے استاد نے اس کو ایک نااہل طالب علم قرار دیا تھا۔ مگر اپنی محنت کی بدولت ترقی کرتے کرتے وہ ایک عظیم سائنس داں بن گیا۔ تھامس الوا ایڈیسن جب آٹھ سال کا بچہ تھا اور اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ اس وقت کا واقعہ ہے۔ ایک روز اس کی خاتون ٹیچر نے اڑنے کے موضوع پر بات کرتے ہوئے بتایا کہ آدمی "پر" نہ ہونے کی وجہ سے نہیں اڑ سکتا جب کہ چڑیا "پر" ہونے کی وجہ سے اڑتی ہے۔ سارے بچے مطمئن ہوگئے مگر الوا کے ذہن میں ایک مختلف مثال آگئی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا کہ میڈم مگر پتنگ تو اڑتا ہے حالانکہ اس کے "پر" نہیں ہوتے۔ ٹیچر بچہ کے اس سوال کا جواب نہ دے سکی۔ مگر اس نے اپنی لاعلمی کا اعتراف کرنے کے بجائے اس کو اپنے وقار کا مسئلہ بنالیا۔ اور بات کو یہاں تک بڑھایا کہ الوا کو اسکول سے نکلوادیا۔ اس نے کہا کہ یہ ایک بے وقوف لڑکا ہے اور بہت زیادہ بولتا ہے۔

تھامس الوا ایڈیسن نے بہت سی سائنسی چیزیں دریافت کیں۔ مثلاً وائرلیس، ٹیلی فون، بجلی ،فوٹوگرافی، بجلی کی روشنی وغیرہ۔ تقریباً ایک سو چھوٹی بڑی ایجادات اس کی طرف منسوب ہیں۔ تھامس الوا ایڈیسن جب بچہ تھا تو وہ بہت زیادہ سوالات کرتا تھا۔ اسکول کی خاتون ٹیچر اس کے سوالات کا جواب نہ دے سکی تو اس نے اس معاملہ کو اپنے وقار کا مسئلہ بنالیا اس بنا پر وہ الوا کی صلاحیت کو دریافت کرنے میں ناکام رہی۔ مگر الوا کی ماں اس نفسیاتی پیچیدگی سے خالی تھی۔ اس لئے اس نے بہت جلد اس حقیقت کو جان لیا کہ الوا کا زیادہ سوال کرنا دراصل اس کی تخلیقی ذہانت کا ثبوت ہے۔ اس نے مادرانہ شفقت کے ساتھ الوا کو علم و تحقیق کے راستہ پر ڈال دیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک عظیم سائنس داں بن گیا۔

حب عاجلہ

انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ فوری فائدہ (immediate gain) کی طرف دوڑتا ہے۔ اور دور کے فائدہ اور نقصان کو بھول جاتا ہے۔ اس بات کو قرآن (الدھر ۲۸) میں اس طرح بیان کیا گیا ہے ——— یہ لوگ جلدی ملنے والی چیز کو چاہتے ہیں اور انھوں نے چھوڑ رکھا ہے اپنے پیچھے ایک بھاری دن کو (ان ھولاء یحبون العاجلة ویذرون ورائھم یوما ثقیلا)

موجودہ دنیا میں عمل کے دو میدان ہیں۔ ایک وہ میدان جس میں اپنا وقت اور مال اور قوت استعمال کی جائے تو فوراً اس کا فائدہ ملتا ہے۔ شہرت اور عزت حاصل ہوتی ہے۔ آدمی سماج کے اندر نیک نام بن جاتا ہے۔ ہر طرف اس کی تعریف ہونے لگتی ہے۔ دوسرا میدان وہ ہے جس میں بظاہر کوئی فوری فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ حتی کہ یہ اندیشہ بھی ہوتا ہے کہ ساری کوشش کرنے کے باوجود آدمی کو کوئی ریٹرن نہ ملے بلکہ برعکس طور پر وہ لوگوں کے درمیان غیر مقبول ہو کر رہ جائے۔ پہلے میدان کو دنیوی میدان اور دوسرے میدان کو اخروی میدان کہا جاسکتا ہے۔ جو آدمی اپنے وقت اور مال اور قوت کو دنیوی میدان میں خرچ کرے اس نے گویا اسی دنیا کی زندگی میں اپنے عمل کا بدلہ لے لیا، ایسے لوگوں کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں (الاحقاف ۲۰) اس کے برعکس جو لوگ اخروی اہمیت والے مقاصد میں اپنے وقت اور اپنے اثاثہ کو استعمال کریں، وہی وہ لوگ ہیں جو موت کے بعد اپنے عمل کا ابدی انعام پائیں گے۔ عقل مند وہ ہے جو اپنے آپ کو وقتی کشش والی چیزوں سے اوپر اٹھائے اور آخرت کو اپنا مقصود بنا کر اس کے لئے عمل کرے۔

مسیح کا کردار

مسیح ابن مریم علیہ السلام کا زمانہ دو ہزار سال پہلے کا زمانہ ہے۔ وہ فلسطین میں پیدا ہوئے اور یہیں دعوت حق کا آغاز کیا۔ اس وقت فلسطین کے علاقہ میں زیادہ تر یہودی آباد تھے۔ ان یہودیوں نے حضرت مسیح کی بدترین مخالفت کی۔ اس کا مختصر تذکرہ قرآن میں ہے اور اس کی تفصیل انجیل (عہد نامہ جدید) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

یہودیوں نے حضرت مسیح کا انکار کیا۔ انھوں نے ان کی تحقیر کی۔ ان کو طرح طرح سے بدنام کیا۔ انھوں نے لوگوں کو حضرت مسیح سے متنفر کرنے کی کوشش کی تاکہ کوئی ان کا ساتھ نہ دے۔ اس وقت فلسطین کے علاقہ میں رومیوں کی حکومت تھی۔ یہودی جب اپنے ذرائع سے حضرت مسیح کا کچھ بگاڑ نہ سکے تو وہ حضرت مسیح کے خلاف جھوٹا کیس بنا کر ان کو رومی عدالت میں لے گئے اور وہاں سے ان کے خلاف فیصلہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔

قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص خدا کی اجازت کے بغیر کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے مطابق فلسطین میں حضرت مسیح کے خلاف جو کچھ ہوا وہ خدا کے اذن کے تحت ہوا۔ پھر خدا نے کیوں اس کا اذن دیا۔ اور ایک پاک اور معصوم انسان کے ساتھ اس قسم کے ظلم کو خدا نے کیوں گوارا کیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس زمانے میں یہودی خدا کے دین کے حامل تھے۔ وہ گویا کہ بگڑے ہوئے مسلمان تھے۔ وہ قساوت کا شکار تھے اور دینی اسپرٹ کو آخری حد تک کھو چکے تھے۔ انھوں نے ظاہری اور نمائشی دینداری کا شاندار لبادہ اپنے اوپر اوڑھ رکھا تھا۔ خدا کو

مطلوب تھا کہ ان کو بے نقاب (expose) کیا جائے۔ ان کی ظاہری دینداری کے پیچھے چھپی ہوئی بے دینی کو کھول کر نمایاں کر دیا جائے۔

اس وقت کے یہودی آپس میں ایک دوسرے کے خلاف ہر قسم کی بے انصافیاں کر رہے تھے۔ مگر یہ واقعات ان کی حقیقت کو بے نقاب کرنے کے لئے کار آمد نہ تھے، کیوں کہ وہ دو طرفہ تھے۔ ان واقعات میں دونوں فریق بے انصافی کا شکار ہوتے تھے۔ اور جس واقعہ میں دونوں ہی فریق نے بے انصافی کر رکھی ہو وہ کسی کی اصل حقیقت کے اظہار کے لئے کافی نہیں ہو سکتا تھا۔

اس واقعہ کے لئے ایک ایسا انسان درکار تھا جو خود مکمل طور پر بے قصور ہو، اس کے باوجود لوگ اپنے سرکشی اور بے انصافی کے مزاج کے بنا پر اس کے خلاف کارروائیاں کرنے کے لئے ڈھیٹ ہو جائیں۔ اس وقت کے فلسطین میں اس قسم کا انسان صرف ایک تھا۔ اور وہ وہی شخصیت تھی جس کو مسیح ابن مریم کہا جاتا ہے۔

حضرت مسیح آخری حد تک ایک پاک اور بے قصور انسان تھے۔ انھوں نے کبھی کسی کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچائی۔ البتہ انھوں نے یہ کیا تھا کہ انھوں نے یہودیوں کے خود ساختہ دین پر تنقیدیں کیں۔ انھوں نے ان کے خود ساختہ اکابر کو اصاغر بتایا۔ انھوں نے یہودیوں کے مزعومات کا غیر دینی ہونا ثابت کیا۔ تاہم یہ امر حق کا لفظی اعلان تھا نہ کہ کوئی قابل دست اندازی جرم۔ یہودی ان کی باتوں کا جواب دلیل کی زبان سے دے سکتے تھے۔ مگر ان کے بڑوں نے حضرت مسیح کی ان باتوں کو لیکر یہودی عوام کو بھڑکایا۔ یہاں تک کہ قوم کی اکثریت کو ان سے بد ظن کر دیا۔

حضرت مسیح کو بدنام کرنا بھی ان کے وجود کو اور ان کے مشن کو ختم کرنے کے لئے

کافی نہ ہوسکا۔اس کے بعد انھوں نے ایک اور مجرمانہ منصوبہ بنایا۔اس وقت فلسطین میں رومیوں کی حکومت تھی۔یہودیوں نے یہ کیا کہ حضرت مسیح پر بے بنیاد الزام لگا کر ان کو رومی عدالت کے سامنے کھڑا کر دیا۔انھوں نے چاہا کہ رومیوں کے ہاتھوں حضرت مسیح کو قتل کروادیں۔مگر خدا نے ان کو اس انجام سے بچالیا۔

حضرت مسیح کی یہ کہانی کوئی انفرادی کہانی نہیں۔یہ خدا کی ایک سنت کی مثال ہے۔ جب بھی کسی قوم میں مذکورہ قسم کا بگاڑ آجائے تو خدا اس کے بگاڑ کو بے نقاب کرنے کے لئے کسی پاکباز انسان کو کھڑا کرتا ہے جو مسیح کا کردار ادا کر کے لوگوں کی حقیقت کو بے نقاب کرے۔

بگڑے ہوئے معاشرے میں ایک بے قصور انسان ہی اس بات کا تاریخی ثبوت بن سکتا ہے کہ اس نے کسی کا کوئی نقصان نہیں کیا۔اس کے باوجود لوگ اس کو نقصان پہنچانے کے درپے ہوگئے۔اس پر جھوٹے الزام لگائے گئے۔اس کو بدنام کر کے عوام سے اس کو کاٹنے کی کوشش کی گئی۔ حتی کہ اس کو جھوٹے مقدمات میں الجھایا گیا۔یہ سب کچھ مسلسل طور پر اور علانیہ طور پر ہوتا رہا مگر وقت کے دینی ٹھیکیدار خاموش رہے۔شیوخ کی خانقاہوں میں اس کی وجہ سے کوئی زلزلہ نہیں آیا۔مفتیوں نے اس کے خلاف فتوے صادر نہیں کئے۔جو علماء دین کا جھنڈا اٹھائے ہوئے تھے انھوں نے ان غیر انسانی اور غیر دینی معاملات کو جانا، مگر وہ مسلسل حدیث کی زبان میں گونگے بنے رہے۔

کسی بگڑی ہوئی قوم کو اس طرح بے نقاب کرنا صرف ایک معصوم اور بے قصور انسان کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح کے ذریعہ اپنا یہی منصوبہ پورا کیا۔

تاریخ برائے نصیحت

قرآن میں حضرت موسیٰ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ خدا نے ان کو پیغمبر بنایا اور یہ حکم دیا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ اور ایام اللہ کے ذریعہ ان کی تذکیر کرو (ابراہیم ۵)

عربی زبان میں ایام کا لفظ تاریخ کے بڑے بڑے واقعات کے لئے بولا جاتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص ایام عرب کا عالم ہے یعنی عرب کے تاریخی واقعات سے (یقال فلان عالم بایام العرب ای بوقائعها) اس آیت میں ایام سے مراد ایام تاریخ ہیں۔ ابن عباس اور مقاتل نے اس کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے کہ اس سے مراد وہ خدائی واقعات ہیں جو پچھلی قوموں کے ساتھ گذرے (عن ابن عباس ایضا ومقاتل :بوقائع الله فی الامم السالفة) الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۹/۳۴۲

مذکورہ حکم جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا اس کا تعلق خود ان کی اپنی قوم سے تھا ، یعنی بنی اسرائیل سے۔ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ بنی اسرائیل کو گذری ہوئی تاریخ یاد دلاؤ اور اس کے ذریعہ ان کی نصیحت کرو۔ نصیحت سے مراد یہاں یہ ہے کہ ان کی تاریخ میں نصرت اور نعمت کے جو واقعات ہیں ان کو یاد دلا دلا کر ان کے اندر شکر کا جذبہ ابھارو۔ اسی طرح ان کی تاریخ میں ابتلا و آزمائش کے جو واقعات ہیں ان کو یاد دلا کر ان کے اندر عبرت کے احساسات کو جگاؤ۔

اس سے معلوم ہوا کہ تاریخ کا مطالعہ برائے فخر نہیں ہے بلکہ برائے نصیحت ہے۔ تاریخ کے مطالعہ کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس کو قومی فخر کا عنوان بنایا جائے۔ اس کے ذریعہ

سے لوگوں کے اندر فخر اور برتری کے جذبات جگائے جائیں۔ تاریخ کے مطالعہ کا یہ طریقہ غیر اسلامی ہے اور جو طریقہ اسلام کے مطابق نہ ہو اس سے کبھی خیر برآمد نہیں ہو سکتا۔

تاریخ کے مطالعہ کا صحیح طریقہ صرف ایک ہے، اور وہ عبرت پزیری ہے۔ تاریخ میں ہمیشہ مختلف قسم کے واقعات ہوتے ہیں، عروج کے بھی اور زوال کے بھی۔ عروج کے واقعات کا مطالعہ اس انداز میں ہونا چاہیئے کہ اس سے لوگوں کے اندر شکر خداوندی کے احساسات جاگیں۔ لوگوں کے اندر یہ سوچ ابھرے کہ ہمیں اور زیادہ خدا کی اطاعت کرنا چاہیے تاکہ ہم اور زیادہ خدا کی نصرت وحمایت کے مستحق قرار پائیں۔ اسی طرح زوال کے واقعات کا مطالعہ اس انداز سے کیا جانا چاہیے کہ لوگوں کے اندر احتساب خویش کی سوچ ابھرے۔ اپنی غلطیوں کی اصلاح ان کی ساری توجہات کا مرکز بن جائے۔

تاریخ سے مراد عام انسانی تاریخ ہے، مسلمانوں کی بھی اور غیر مسلموں کی بھی۔ دونوں ہی قسم کی تاریخوں میں ہمیشہ عبرت ونصیحت کے بے شمار پہلو ہوتے ہیں۔ اور دونوں میں سے یکساں طور پر وہ فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے جو تاریخ کے مطالعہ سے مطلوب ہے۔

تاریخ کا مطالعہ صرف اس انسان کے لئے مفید ہوتا ہے جو اس کو نصیحت کے ذہن کے تحت پڑھے، کسی اور ذہن کو لے کر تاریخ کا مطالعہ مفید نہیں ہو سکتا۔ تاریخ تجربات انسانی کا مجموعہ ہے، کامیابی کے تجربات بھی اور ناکامی کے تجربات بھی۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ کامیابی کے تجربات سے مثبت سبق لے، اور ناکامی کے تجربات سے یہ سیکھے کہ اس کو کیا نہیں کرنا چاہیے تاکہ اس کی کامیابی مشتبہ نہ ہو۔

اعتدال کی روش

پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ خدا نے مجھ کو نو باتوں کا حکم دیا ہے۔ روایت کے مطابق، ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ غصہ اور رضامندی دونوں حالتوں میں میں انصاف کی بات کہوں (کلمة العدل فی الغضب والرضی) مشکاۃ المصابیح ۱۴۷۲/۳

یہ خدا سے ڈرنے والے ایک آدمی کی نہایت صحیح پہچان ہے۔ خدا کا ڈر اور آخرت کی پکڑ کا اندیشہ آدمی کو وہ آدمی بنادیتا ہے جس کو انسان اصلی (man cut to size) کہا جاسکتا ہے۔ یہ وہ انسان ہے جس کے اندر سے کبر اور نمائش اور جھوٹے وقار جیسے جذبات ختم ہو گئے ہوں۔ عجز وانکساری اس کی صفت بن گئی ہو، جو کہ کسی انسان کے اندر اس وقت لازماً پیدا ہوتی ہے جب کہ وہ خدا کی عظمتوں کو پالے۔

جب کسی آدمی کو غصہ آتا ہے تو اس وقت وہ اپنے میں نہیں رہتا۔ اس کے اندر انتقام کے جذبات جاگ اٹھتے ہیں۔ وہ چاہنے لگتا ہے کہ جس آدمی نے اس کو غصہ دلایا ہے اس کے خلاف جو کچھ کر سکتا ہے کرے مگر سچے مومن کے لئے اس قسم کا رویہ جائز نہیں۔

معتدل حالت میں ہر آدمی درست بات کرتا ہے۔ مگر جب اس کے سینہ میں غصہ کی آگ بھڑک اٹھے تو وہ اعتدال سے ہٹ جاتا ہے۔ یہی انسان کا امتحان ہے۔ جو آدمی دونوں حالتوں میں منصفانہ روش پر قائم رہے وہ خدا کا مطلوب انسان ہے اور جو آدمی اعتدال کی حالت میں ٹھیک رہے اور غصہ کی حالت میں کچھ اور بن جائے وہ خدا کا مطلوب بندہ نہیں۔

یہ آئیڈیل ہے، اور آئیڈیل پر چلنا ہر آدمی کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے اللہ تعالٰی نے یہ رخصت دی ہے کہ جو آدمی جذبات سے مغلوب ہو کر غلط حرکت کر بیٹھے اس کو چاہیے کہ وہ اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہو اور اس کی شرعی تلافی کرے۔

اعتصام بحبل اللہ

قرآن (آل عمران ۱۰۳) میں اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ــــــ

اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور متفرق نہ ہو۔ اور اللہ کا یہ انعام اپنے اوپر یاد رکھو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پھر اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی۔ پس تم اس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے (واعتصموا بحبل الله جميعا ولاتفرقوا واذكروا نعمة الله عليكم اذ كنتم اعداءً فالف بين قلوبكم فاصبحتم بنعمته اخوانا)

اس آیت میں اللہ کی رسی سے مراد اللہ کی کتاب قرآن ہے۔ اور تفرق کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ اپنے اپنے ذاتی مفاد کو لے کر متفرق نہ ہو جاؤ اور اللہ کے دین میں سب بھائی بھائی بن کر رہو (ويجوز ان يكون معناه ولاتفرقوا متابعين للهوى والاغراض المختلفة، وكونوا فى دين الله اخوانا) تفسير القرطبي ۴/۱۵۹

زندگی کے دو طریقے ہیں ــــــ متابعت قرآن، متابعت ھویٰ۔ جو لوگ سچے مومن ہوں اور پوری سنجیدگی کے ساتھ قرآن کا اتباع کرنا چاہتے ہوں ان کی ساری توجہ خدائی احکام کی طرف لگ جائے گی۔ ان کا تقویٰ ان کے اندر یہ شدید جذبہ پیدا کرے گا کہ وہ بے لاگ طور پر خدا کی مرضی کو جانیں اور پوری طرح اس پر قائم ہو جائیں۔ اس کے برعکس جن لوگوں کی دلچسپی کا مرکز ان کی خواہشیں اور ان کے اغراض ہوں وہ کبھی یکساں ذہن کے تحت نہیں سوچ سکتے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی خواہش اور اپنے مفاد کی طرف دوڑے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک کی راہ دوسرے سے الگ ہو جائے گی۔

جو لوگ سچائی کے ساتھ خدا کی کتاب کو اپنا رہنما بنائیں ان کے اندر لازمی طور پر

اتحاد ہوگا۔ اور جن لوگوں کی خواہشیں ان کی رہنما بن جائیں وہ لازمی طور پر متفرق اور مختلف ہو جائیں گے، وہ کبھی متحد گروہ نہیں بن سکتے۔

کتاب اللہ کو رہنما بنانے کی صورت میں یہ ہوتا ہے کہ برتر سچائی لوگوں کی توجہ کا مرکز ہوتی ہے۔ یہ برتر سچائی چونکہ ایک ہے اس لئے تمام لوگوں کی توجہ صرف ایک نقطہ پر لگ جاتی ہے۔ اس فکری اتحاد کا نتیجہ عملی اتحاد کی صورت میں نکلتا ہے۔

اس کے برعکس جب لوگوں کی توجہ کا مرکز ان کی اپنی خواہش بن جائے تو ہر ایک کی خواہش چونکہ الگ الگ ہوتی ہے اس لئے لوگوں کے نشانے بھی الگ الگ ہو جائیں گے۔ اسی کے نتیجہ کا دوسرا نام اختلاف و افتراق ہے۔

آیت میں "جمیعاً" کا لفظ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ قرآن کی مخلصانہ پیروی کا ذہن اتحاد کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں پوری جماعت متحد العمل بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس اہواء اور اغراض عین اپنی نوعیت کے اعتبار سے تفرق کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ افکار و اعمال کے اختلاف کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

اجتماعی زندگی میں ایک کو دوسرے سے شکایت پیدا ہونا بالکل فطری ہے۔ عام حالات میں یہ شکایت پیدا ہو کر بڑھتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ لوگ اپنی اپنی شکایتوں کی بنا پر ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ تفرق کی صورت میں نکلتا ہے۔

مگر جن لوگوں کو ایمانی شعور حاصل ہو جائے وہ انسانی شکایتوں سے اوپر اٹھ کر خدا میں جینے لگتے ہیں۔ شکایتیں ان کے اتحاد میں رکاوٹ نہیں بنتیں۔ وہ شکایتوں کے باوجود اس طرح ہو جاتے ہیں جیسے کہ وہ آپس میں بھائی بھائی ہوں۔

فریب جلوہ کی یہ کشش آج سیکڑوں گنا زیادہ بڑھ چکی ہے۔ پھر آج کسی شخص کے لیے یہ کتنا مشکل ہوگا کہ وہ بزم عالم سے اپنے دل کو اوپر اٹھا سکے۔

ادھیڑ عمر کے ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ بہت پریشان نظر آئے۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں ایک بینک میں میں افسر تھا، اچھی تنخواہ تھی۔ پھر میں نے امریکن لڑکی سے شادی کی۔ اس کے بعد میرے اخراجات بہت بڑھ گئے۔ بینک میں میں نے ایک فراڈ کیا۔ میرا فراڈ پکڑا گیا۔ میری ملازمت ختم ہوگئی۔ برسوں تک میں ہاؤس اریسٹ رہا۔ میری صحت اور اقتصادی زندگی دونوں تباہ ہوگئی۔ اب بتائیے کہ میں کیا کروں۔

میں نے دو مشورے دیے۔ میں نے کہا کہ پہلی بات یہ ہے کہ آپ اپنی حد (Limit) کو جانئے۔ آپ نے جو فراڈ کیا وہ آپ کی طاقت سے باہر تھا۔ آپ اپنی حد پر قائم نہیں رہے۔ دوسری بات یہ کہ آپ ماضی کو مکمل طور پر بھلا دیجئے۔ اس بات کو اچھی طرح جان لیجئے کہ آپ جہاں آج ہیں وہیں سے دوبارہ آپ اپنا سفر شروع کر سکتے ہیں، پیچھے سے سفر کرنا آپ کے لیے ممکن نہیں۔

اس دنیا میں ہر آدمی غلطی کرتا ہے۔ تاہم آدمی کو دو بات ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔ ایک یہ کہ یہاں غلطی کرنا آسان ہے۔ مگر غلطی کو نبھانا انتہائی مشکل کام ہے۔ دوسرے یہ کہ نقصان خواہ کتنا ہی بڑا ہو وہ آدمی کے سارے امکانات کو ختم نہیں کرتا۔ ہر نقصان کے بعد یہ امکان باقی رہتا ہے کہ آدمی از سر نو اپنی قوتوں کو اکٹھا کرے، وہ حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرکے دوبارہ نئی کامیابی حاصل کرلے۔

۲۸ اگست کی شام کو پروگرام کے مطابق ہم لوگ سنٹرل جرسی (South Brons Wick) کے لیے روانہ ہوئے۔ یہاں ڈاکٹر مھدی نقی کے مکان پر ایک اجتماع رکھا گیا تھا:

Tel. (908) 297-8037, 297-4100

یہ پچاس میل کا سفر تھا جو ایک گھنٹہ میں طے ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر راستہ میں ایک جگہ کار ایکسیڈنٹ کی وجہ سے ٹریفک جام ہوگئی اور ہم لوگ ڈیڑھ گھنٹہ میں پہنچ سکے۔ میرے سر میں چکر کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ لوگ ایر سِک ہوتے ہیں، میں کار سِک ہوں۔ انھوں نے کہا کہ امریکہ میں تو آدمی کار انجوائے کرتا ہے۔ مغرب کے وقت ہم لوگ

ڈاکٹر مہدی نقی کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ یہ بہت کھلی اور پُرفضا جگہ تھی۔

مغرب کی نماز کے بعد کھانا کھایا گیا۔ اس کے بعد ہال نما وسیع بیسمنٹ میں اجتماع ہوا۔ تعلیم یافتہ مسلمان عورتیں اور مرد بڑی تعداد میں اکٹھا تھے۔ میں نے اپنی مفصل تقریر میں بتایا کہ قرآن وحدیث میں کہا گیا ہے کہ اسلام ہمیشہ غالب رہے گا، وہ کبھی مغلوب ہونے والا نہیں۔ اس سے غلط طور پر کچھ لوگوں نے سیاسی غلبہ مراد لے لیا ہے۔ اور بزعم خود اسلام کا سیاسی غلبہ قائم کرنے کے لیے جگہ جگہ بے فائدہ لڑائی چھیڑے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے مراد اسلام کا نظریاتی غلبہ ہے، اور فکری اور نظریاتی غلبہ بلاشبہہ ہر دوسرے غلبہ سے زیادہ عظیم ہے۔ پھر تفصیل سے بتایا کہ اسلام کا یہ غلبہ ہمیشہ قائم رہا ہے اور آج سائنسی دور میں بھی وہ آئیڈیالوجیکل سپر پاور کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

پھر میں نے بتایا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ تشدد اور جنگ کی تباہ کن سرگرمیوں کو چھوڑ کر اسلام کی فکری برتری کے پہلو کو نمایاں کریں۔ اس سے ان کی اپنی روحانی ترقی بھی ہوگی اور دنیا کے لوگ تیزی سے اسلام کی طرف مائل ہوں گے۔ رات کو ڈیڑھ بجے میں اپنی رہائش گاہ پر واپس آیا۔

۱۹۸۸ میں پان امریکن ورلڈ ایرویز (پان ایم) کا ایک جہاز اسکاٹ لینڈ کے شہر (Lockerbie) کے اوپر اڑ رہا تھا کہ اس کے اندر بم پھٹا اور وہ تباہ ہوگیا۔ ۲۷۰ آدمی مر گئے جو زیادہ تر امریکی تھے۔ یہ ایک بڑی امریکی کمپنی تھی مگر اس کے بعد وہ بند ہوگئی۔ جب کہ ٹھیک اسی طرح ایر انڈیا کا ایک جہاز دوران پرواز بم کا شکار ہوا اور وہ سمندر میں گر پڑا۔ مگر ایر انڈیا اس کے بعد بھی بند نہیں ہوئی۔ اس فرق کا سبب مجھے موجودہ سفر کے دوران معلوم ہوا۔

اصل یہ ہے کہ امریکہ میں فرد کے حقوق بہت زیادہ ہیں۔ چنانچہ پان ایم کے حادثہ کے بعد مرنے والے مسافروں کے ورثاء نے یہاں کی عدالتوں میں مقدمات کیے اور تلافی کے لیے بہت بڑی بڑی رقموں کا مطالبہ کیا۔ عدالت نے ہر ایک کے حق میں فیصلے دیے۔ اس کے بعد کمپنی کو تمام لوگوں کو بڑی بڑی رقمیں دینی پڑیں۔ حتی کہ اس کے اثاثے فروخت ہو گئے۔ اس طرح پان ایم دیوالیہ ہو کر بند ہوگئی۔

پان ایم کے حادثہ کا سبب دو لیبی باشندے تھے جن کو معمر قذافی نے اس کام کے لیے

مامور کیا تھا۔ چنانچہ امریکہ نے مطالبہ کیا کہ مذکورہ دونوں لیبی اس کے حوالے کیے جائیں۔ لیکن معمر قذافی نے ان کو حوالے نہیں کیا۔ کیوں کہ ان کو اندیشہ تھا کہ ان دونوں آدمیوں پر جب مقدمہ چلایا جائے گا تو وہ سارے راز کھول دیں گے۔ اب معمر قذافی کو چاہیے تھا کہ وہ غلطی کا اعتراف کرکے امریکہ سے اپنے معاملات درست کرتے، اس کے بجائے انھوں نے "سبق سکھانے" کے اصول کے تحت امریکہ کے خلاف مزید تخریبی کارروائیاں شروع کردیں۔

اسی سلسلہ کا ایک قصہ وہ ہے جو میں نے نیویارک ٹائمس کے شمارہ ۳۱ اگست ۱۹۹۶ میں پڑھا۔ اے پی کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ کے بلیک لیڈر فرا خان (Louis Farra Khan) کو "ہیومن رائٹس ایوارڈ" کے تحت ڈھائی لاکھ ڈالر ($ 250,000) دیے جارہے ہیں۔ اس کے علاوہ قذافی نے ان کو مزید ایک بلین ڈالر دینے کا وعدہ کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حد درجہ غیر دانش مندانہ فعل ہے۔ یہ صرف امریکیوں کی نظر میں مسلمانوں کی تصویر بگاڑنے کے ہم معنی ہے۔ اس طرح مسائل اور زیادہ بڑھیں گے، وہ کسی بھی درجہ میں کم ہونے والے نہیں۔

پچھلے سالوں میں مسلمانوں کے درمیان جو تشدد پسند گروپ ابھرے ہیں اور جگہ جگہ اسلام کے نام پر بم اور گن کی تحریکیں چلارہے ہیں، اس نے اسلام کو کوئی فائدہ تو نہیں پہنچایا۔ البتہ اس سے اسلام کو بے پناہ نقصان ہوا ہے۔ اس نے صلیبی جنگ کی بھولی ہوئی یادوں کو ازسرنو مغربی انسان کے ذہن میں جگا دیا ہے۔ لوگ سوچنے لگے ہیں کہ کیا تشدد اور خوں ریزی کا نیا دور شروع ہوگیا ہے۔ ایک تعلیم یافتہ امریکی نے کہا کہ یہ اسلامی لوگ آخر کیا کرنا چاہتے ہیں:

What do the Islams have in mind now?

اس امریکی نے اسلام کے لفظ کو جمع کی صورت میں استعمال کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اسلام کو مسلمانوں کے ہم معنی سمجھ رہا ہے۔ یہ کتنا بڑا نقصان ہے جو موجودہ مسلمانوں کے ذریعہ اسلام کو پہنچا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان جگہ جگہ جو انتہا پسندانہ تحریکیں چلارہے ہیں وہ حقیقۃً ان کی قومی تحریکیں ہیں۔ مگر ان مسلمانوں نے ان کو اسلام اور اسلامی جہاد کے نام پر چلا رکھا ہے۔

یہ بلاشبہ ایک سرکشی کا فعل ہے اور وہ سراسر اسلامی مفاد کے خلاف ہے۔ مسلمانوں کے اوپر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ یا تو وہ ان متشددانہ سرگرمیوں کو مکمل طور پر بند کردیں یا کم از کم

وہ ایسا کریں کہ اسلام کے بجائے قوم اور ملک کے نام پر ان کو انجام دیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں اور اس غیر اسلام کو بدستور اسلام کے نام پر جاری رکھیں تو مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ وہ سخت طور پر خدا کی پکڑ میں آجائیں گے۔

جارج واشنگٹن (1732-99) امریکہ کا پہلا صدر تھا۔ وہ پیروں سے معذور تھا اور وھیل چیر پر رہتا تھا۔ مگر اس نے امریکہ کی تاریخ میں بہت بڑا کام کیا ہے۔ ۱۹۲۹ میں یہاں زبردست اقتصادی بحران آیا۔ اس وقت جارج واشنگٹن نے نہایت مثبت اقدامات کیے اور لوگوں کے حوصلے کو بلند کیا۔ وہ کہتا تھا کہ:

You have nothing to fear except the fear itself.

آزادی کے بعد برصغیر ہند میں بد قسمتی سے کوئی "واشنگٹن" نہیں اٹھا۔ اور یہی ہماری تباہی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

ایک کتاب میں مزاحیہ جواب پر ایک باب (Artless art of repartee) تھا۔ اس میں یہ قصہ لکھا تھا کہ ایک وکیل بہت تیز تھا۔ چنانچہ ایک جج اس سے جلنے لگا۔ اور چاہنے لگا کہ کسی نہ کسی طرح اس کی انسلٹ کرے۔ ایک بار جج کے یہاں ایک کیس تھا۔ مذکورہ وکیل اس پر اپنے آرگومنٹ پیش کر رہا تھا۔ اس وقت جج کے پاس اس کا کتا بیٹھا ہوا تھا۔ جج نے چاہا کہ وکیل کو نظر انداز کرے۔ چنانچہ وہ اپنے کتے کی طرف متوجہ ہو کر اس سے بولنے لگا۔ اس کے بعد وکیل خاموش ہو گیا۔ جج نے کہا کہ آپ اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھئے۔ وکیل نے جواب دیا کہ میرا خیال ہے کہ جناب عالی اس وقت مشورہ میں مصروف ہیں:

I think your lordship is under consultation.

جواب کا یہ انداز بے حد موثر انداز ہے۔ اس انداز کا جواب دینے کے لیے سب سے زیادہ ضروری شرط یہ ہے کہ آدمی جھنجلاہٹ میں مبتلا نہ ہو اور ہر حال میں اپنے ذہنی توازن کو برقرار رکھے۔ مذکورہ وکیل اتنا موثر جواب دینے پر صرف اس لیے قادر ہوا کہ وہ جج کے توہین آمیز رویہ پر غصہ نہیں ہوا۔ اگر وہ غصہ ہو جاتا تو کبھی بھی وہ جج کو اتنا موثر جواب نہیں دے سکتا تھا۔

نیویارک میں ہم لوگ صبح کو جس راستہ پر ٹہلنے کے لیے جاتے تھے، وہاں سلسلہ وار بہو دیوں

کی فروٹ وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ ہم دیکھتے تھے کہ صبح سویرے ہی یہ تمام دکانیں کھل جاتی ہیں۔ لیکن ۳۱ اگست کی صبح کو ہم یہاں سے گزرے تو تمام دکانیں بند پڑی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ آج سنیچر کا دن ہے اس لیے دکانیں بند ہیں۔ یہ لوگ ۲۴ گھنٹہ تک یوم سبت مناتے ہیں جیسا کہ بائبل میں ہے اور جمعہ کی شام سے لے کر سنیچر کی شام تک کوئی کاروبار نہیں کرتے۔

میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ اسلام میں بھی جمعہ کو یہی حیثیت دی گئی ہے۔ مگر آپ سورہ جمعہ کو پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جمعہ کی نماز کی اذان ہو تو اس وقت اپنا کاروبار چھوڑ کر مسجد آجاؤ۔ اور جب جمعہ کی نماز پوری ہو جائے تو دوبارہ اپنے کاروبار کی طرف واپس چلے جاؤ۔ دونوں کا تقابل کیجئے، تو معلوم ہوگا کہ اسلامی شریعت کا قانون مکمل طور پر فطری ہے اور یہودی شریعت کا قانون سراسر غیر فطری۔

امریکہ کے صدر کلنٹن (Bill Clinton) نے ۲۹ اگست کو اپنی تقریر میں امریکی قوم کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم دنیا کے پولیس مین نہیں بن سکتے:

We cannot become the World's policeman.

میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات امریکی قوم کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ آپ کسی امریکی سے ملیں اور اس سے بات کریں تو آپ فوراً محسوس کریں گے کہ اس کو عالمی سیاست سے بہت کم واقفیت ہے۔ اس کی دلچسپیوں کا مرکز اس کا اپنا ملک امریکہ ہے نہ کہ ساری دنیا۔ یہاں کے ریڈیو اور ٹی وی کے پروگرام بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

۳۰ اگست کو جمعہ کی نماز کے بعد نیویارک کی مسجد میں ایک مسلمان بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ وہ بہت عرصہ سے امریکہ میں رہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ امریکہ ہر جگہ مسلم ملکوں کے اندر دخل اندازی کر رہا ہے۔ ہمیں امریکہ کو ڈاؤن کرنا ہوگا، ورنہ وہ ہمیں جینے نہیں دے گا۔ میں نے کہا کہ یہ سارا مفروضہ ہی غلط ہے۔ امریکہ تو انتہائی حد تک ایک خود پسند ملک ہے۔ کسی مسلم یا غیر مسلم ملک میں اس کی "دخل اندازی" بالادستی حاصل کرنے کے لیے نہیں ہوتی بلکہ اپنا انٹرسٹ محفوظ کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ اور اپنے انٹرسٹ کو محفوظ کرنا ایک فطری جذبہ ہے جو ہر جگہ جاری رہتا ہے۔ حتی کہ اسلامی حکومت میں بھی۔

اس معاملہ میں ہمیں عدل سے کام لینا چاہیے —— ہمیں جاننا چاہیے کہ ہم کسی فرد یا قوم کی مذمت ایک ایسے کام کے لیے نہیں کر سکتے جس کو ہم خود بھی قانون فطرت کے تحت اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ ایک امریکی نے کہا:

We must act where we see that our interests are at stake.

امریکہ میں پیدا ہونے والے ایک مسلم نوجوان نے سوال کیا کہ نماز کے طریقوں میں اتنا فرق کیوں ہے۔ کوئی ایک ڈھنگ سے پڑھتا ہے اور کوئی دوسرے ڈھنگ سے۔ میں نے کہا کہ جو کچھ فرق ہے وہ جزئی آداب میں ہے نہ کہ بنیادی ارکان میں۔ اور جزئی آداب میں ہمیشہ فرق ہوتا ہے۔

میں نے کہا کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں نماز پڑھا رہے تھے۔ رکوع سے اٹھنے کے بعد عام لوگوں نے خاموشی کے ساتھ ربنا لک الحمد کہا۔ ایک صاحب بلند آواز سے کہہ اٹھے: ربنا لک الحمد حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ نماز ختم ہوئی تو رسول اللہؐ نے پوچھا کہ کس نے اس طرح بلند آواز سے کہا تھا۔ وہ صاحب ڈرے کہ شاید مجھ سے غلطی ہوگئی۔ پھر رسول اللہؐ نے کہا کہ وہ اتنا اچھا کلمہ تھا کہ اس کو لینے کے لیے بہت سے فرشتے دوڑ پڑے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز کا جو مقرر طریقہ (prescribed method) ہے اس کا مقصد صرف ایک بنیادی ڈھانچہ (basic structure) دینا ہے۔ اس بنیادی ڈھانچہ میں جزئی اور ضمنی فرق بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز کوئی ٹکنکل قسم کا عمل نہیں۔ وہ ایک کیفیاتی عمل ہے۔ اور کیفیاتی عمل کبھی بھی بالکل لگے بندھے انداز کا نہیں ہو سکتا۔

نماز کے بیک وقت دو پہلو ہیں۔ ایک اس کا ظاہری ڈھانچہ، اور دوسرے اس کی داخلی اسپرٹ جس کو قرآن میں خشوع کہا گیا ہے۔ اس خشوع کا تعلق کیفیت سے ہے، اور کیفیت کبھی بھی مکمل طور پر روٹین کی پابند نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہؐ اور صحابہ کی نمازوں کے بارے میں جو روایات حدیثوں کی کتابوں میں آئی ہیں ان میں بہت سے ضمنی فرق پائے جاتے ہیں۔ یہ فرق کیفیات کے تنوع کی بنا پر ہیں جو بالکل فطری ہے۔

امریکہ میں مقیم ہندستانی بہت سے اپنے اخبارات شائع کرتے ہیں۔ انھیں میں سے

ایک انڈیا مانیٹر (India Monitor) ہے جو نیویارک سے چھپتا ہے۔ اس کو یہاں کے مقیم ہندو نکال رہے ہیں۔ اس کا شمارہ ۱۸ اگست ۱۹۹۶ دیکھا۔ تقریباً پورا اخبار برصغیر ہند کی خبروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی ایک رپورٹ ہندستان کی پرائیویٹ ایر کمپنیوں کے بارے میں تھی جس کے ساتھ گجرات ایرویز کی تصویر شامل تھی :

امریکہ میں مختلف ملکوں کے اور مختلف مذہبوں کے لوگ بستے ہیں۔ ہر قوم اور ملت کے لوگ اپنا اپنا اخبار نکالتے ہیں۔ مثلاً ہندو، مسلمان، سکھ، فلسطینی، مصری، وغیرہ۔ مگر ان میں سے ہر اخبار کی حیثیت کمیونٹی پیپر کی ہے۔ یعنی جو گروہ اخبار نکالتا ہے اسی کے افراد اس کو پڑھتے ہیں۔ یہ صرف یہودیوں کی خصوصیات ہے کہ وہ جو اخبار یا میگزین نکالتے ہیں اس کو یہودیوں کے علاوہ سبھی لوگ پڑھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے لوگ اپنے اخبار میں صرف اپنی باتیں چھاپتے ہیں۔ اور یہودیوں کے اخبار میں سب کی باتیں موجود ہوتی ہیں۔

انڈیا مانیٹر کے رپورٹروں میں کئی مسلم نام بھی دکھائی دیے۔ مثلاً شہید لطیف، جاوید نقوی، راجہ اصغر، شیخ مشتاق، رمضان حسین۔ انڈیا کی آزادی کے پچاس سال پورا ہونے (commemoration) کے طور پر ایک پورا صفحہ تھا۔ اس میں گاندھی، نہرو، پٹیل، ٹیگور، سروجنی نائیڈو، امبیڈکر، رادھا کرشنن، مولانا آزاد کی تصویریں تھیں۔ ہر تصویر کے ساتھ اس کا ایک قول نقل کیا گیا تھا اور پھر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا :

کئی آوازیں، ایک قوم (Many voices, one nation)

سروجنی نائیڈو کی تصویر کے ساتھ ان کا یہ قول نقل کیا گیا تھا کہ : کوئی بھی آپ کو وہ چیز نہیں دے سکتا جس کو لینے کی خود آپ کے اندر استعداد نہ ہو :

No one can give to you what you do not have the capacity to take.

یکم ستمبر کو لیبر ڈے کی چھٹی تھی۔ اس دن بڑی تعداد میں امریکی تفریح کے لیے مختلف مقامات پر چلے جاتے ہیں۔

۲ ستمبر ۱۹۹۶ کی شام کو ہم لوگ فلاڈلفیا سے دوبارہ نیویارک واپس آگئے۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہالینڈ سے آئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ہالینڈ میں صدفی صد تعلیم ہے، جب کہ امریکہ میں ابھی تک ۹۷ فی صد تعلیم پائی جاتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وہاں بڑے بڑے لوگ بھی سادہ انداز میں رہتے ہیں۔ ہالینڈ کے پرائم منسٹر کو ایک بار ماحولیات کے موضوع پر ٹی وی پر بولنا تھا۔ ان کو یہ کہنا تھا کہ لوگ گیس کے خرچ کو گھٹائیں تاکہ فضائی آلودگی میں کمی ہوسکے۔ اس کی ایک تدبیر انھوں نے یہ بتائی کہ لوگ کار کا استعمال کم کریں اور بائیسکل کا استعمال شروع کریں۔ اس مشورہ پر پہلا عمل خود پرائم منسٹر نے کیا۔ چنانچہ وہ بائیسکل پر سوار ہوکر ٹی وی اسٹیشن گئے۔

مولانا ذکی الدین شرفی نہایت مخلص اور نہایت باکردار آدمی ہیں۔ اسی کے ساتھ ان کی دوسری ممتاز صفت یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اغیار کی سازشوں کے بارہ میں ان کی معلومات کا خزانہ اتنا زیادہ ہے کہ وہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ وہ عجیب وغریب سازشیں دریافت کیے ہوئے ہیں۔ مثلاً انھوں نے کہا کہ سوویت یونین کی شکست یہودیوں کی سازش سے ہوئی۔ یہ یہودی ہی تھے جنھوں نے میکائیل گورباچیوف کو پلانٹ کیا تھا۔

ان کا خیال تھا کہ میں اس قسم کی سازشوں سے بالکل بے خبر ہوں۔ میں نے کہا کہ میرے ایک قریبی عزیز شاید آپ سے بھی زیادہ اس فن کے اکسپرٹ ہیں۔ ان کے دماغ کو سازشوں کی انسائیکلوپیڈیا کہا جاسکتا ہے۔ اس لیے میرے اور آپ کے درمیان جو فرق ہے وہ واقفیت کا نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ سازش کے مقابلہ میں کیا کیا جائے۔ آپ لوگ سازش کے انکشافات کو کام سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس میں قرآن کی اس آیت کو پکڑے ہوئے ہوں: وان تصبروا وتتقوا لا یضرکم کیدھم شیئاً۔ میرے نزدیک اس کی اہمیت نہیں ہے کہ لوگ سازش کر رہے ہیں۔ اصل دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ مسلمانوں میں صبر وتقویٰ ہے یا نہیں جو اس کا اصل توڑ ہے۔

ایک پاکستانی بزرگ سے پاکستان کی سیاست پر بات ہو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ پاکستان میں سیاسی مجرموں کے احتساب (عملاً بھٹو کے احتساب) کی جو تحریک چلائی گئی وہ سراسر غلط تھی۔ وہ اس کی تائید کر رہے تھے۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ "انڈیا کے علماء اس بات کو سمجھ نہیں سکتے کہ بھٹو کتنا بڑا عذاب تھا، اور اس کی بیٹی اس سے بھی زیادہ بڑا عذاب ہے"۔

میں نے کہا کہ آپ نے میری بات کہہ دی۔ میں بھٹو کو صالح انسان نہیں مانتا۔ میں صرف بھٹو کو ختم کرنے کی سیاست کو غیر صالح قرار دیتا ہوں۔ اور اس کا اقرار خود آپ نے اپنی زبان سے کر لیا۔ میرا کہنا یہ ہے کہ کسی عوامی لیڈر کو قتل کرنا ہمیشہ الٹا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد شہید بن کر وہ لوگوں کے درمیان ہیرو بن جاتا ہے۔ آپ لوگوں کی یہی پالیسی تھی جس نے خود آپ کے الفاظ میں چھوٹے عذاب کو ختم کر کے زیادہ بڑا عذاب اپنے اوپر مسلط کر لیا۔

یہی وہ حکمت ہے جس کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ابی بن کعب کو قتل نہیں کرایا۔ کیوں کہ آپؐ جانتے تھے کہ زندہ ابی بن کعب چھوٹا مسئلہ ہے اور مقتول ابی بن کعب زیادہ بڑا مسئلہ۔

عرصہ ہوا امریکہ سے اسرائیل اور یہود کے بارے میں کتابیں چھپی ہیں۔ ان کا ٹائٹل ہے، ہم یہود اور اسرائیل کی کیا قیمت ادا کر رہے ہیں :

1. What price Israel

2. What price Jews

ان کتابوں میں دکھایا گیا ہے کہ یہودی کس طرح امریکہ کو لوٹ رہے ہیں۔ مسلمانوں کو یہ کتابیں بہت پسند ہیں۔ بعض افراد نے جوش کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر میرے نزدیک ان کتابوں کا صحیح تاثر یہ نہیں کہ یہودیوں کو "لوٹنے والا" ثابت ہوتے ہوئے دیکھ کر آپ خوش ہوں۔ اصل یہ ہے کہ ان کتابوں سے یہ سبق لیا جائے کہ موجودہ زمانہ میں آنے والی تبدیلیوں کے نتیجہ میں کس طرح یہ امکان پیدا ہو گیا ہے کہ ایک گروپ انتہائی چھوٹی اقلیت رہتے ہوئے کس طرح پورے ملک کو اپنے حوصلوں کی تسکین کا میدان بنا سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ۱۹۴۸ میں فلسطینیوں نے ٹکراؤ کے بجائے اگر اسی پالیسی کو اختیار کیا ہوتا تو آج فلسطین میں ان کی وہی حیثیت ہوتی جو آج یہودیوں کی امریکہ میں ہے۔

ایک صاحب نے امریکہ کے تعلیمی نظام کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ یہاں کے اسکولوں میں بچوں کو جب کسی مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کو بتایا جاتا ہے تو بورڈ پر لکھ کر کہا جاتا ہے کہ ——— یہ حقیقت ہے، اور یہ رائے ہے :

These are facts, these are opinions.

انھوں نے کہا کہ اس طرح ہمارے بچوں کے دلوں میں شکوک ڈالتے ہیں۔ وہ گھر میں آتے ہیں تو جو مذہبی معاملات ان کی سمجھ میں نہیں آتے ان کی بابت وہ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو ایک رائے (opinion) ہے۔

میں نے کہا کہ یہ ذہن حقیقی اسلام کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ کیوں کہ وہاں تو ہر چیز حقیقت ہے۔ مگر آپ اس کو خطرہ اس لیے محسوس کرتے ہیں کہ آپ نے حقیقی اسلام کے ساتھ خود اپنی طرف سے اس میں بہت سے اضافے کر رکھے ہیں۔ یہ اضافے غیر فطری اور غیر ثابت شدہ ہیں۔ اگر آپ ان اضافوں کو ہٹا دیں تو اس کے بعد جو اسلام بچے گا وہ ان بچوں کو حقیقت ہی دکھائی دے گا۔

ایک مجلس میں میں نے امریکہ میں مذہبی آزادی اور مواقع دعوت کے بارے میں کچھ کہا۔ پاکستان سے آئے ہوئے ایک بزرگ نے فرمایا کہ آپ انڈیا میں رہتے ہیں، آپ امریکہ کے بارہ میں نہیں جانتے۔ ہم یہاں رہتے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ امریکہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ ہی لوگ جب ماڈرن کمیونی کیشن کی بات کرتے ہیں تو آپ کہتے ہیں کہ یہ گلوبل ویلج کا زمانہ ہے۔ پھر آپ ہی یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ انڈیا میں رہنے والا آدمی امریکہ کے بارہ میں نہیں جان سکتا۔

میں نے کہا کہ مجھ میں اور آپ لوگوں میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ آپ بھی یہاں عملاً اپنی ہی سوسائٹی میں رہتے ہیں۔ خالص امریکیوں سے آپ کا انٹرایکشن بہت کم ہوتا ہے۔ امریکی معاشرہ کے بارہ میں آپ کی معلومات زیادہ تر میڈیا کی اطلاعات پر مبنی ہیں۔ یہی میرا بھی حال ہے۔ میں پانچ بار امریکہ آیا ہوں۔ اس کے علاوہ انڈیا میں ہر روز امریکہ کے بارے میں پڑھتا رہتا ہوں۔ اس لیے عملاً میرے اور آپ کے درمیان بہت زیادہ فرق نہیں۔

محمد البھناس ایک مصری ہیں۔ وہ امریکہ کی ایک مسجد میں خطبہ اور امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے لائق آدمی کی قدردانی کرنا نہیں جانتے۔ جہاں کوئی آدمی ابھرا وہ فوراً اس کو نیچا دکھانے کے لیے سرگرم ہو جاتے ہیں۔ ہزار برس میں مسلمانوں نے صرف یہ سیکھا ہے کہ خود اپنی قیادت کو کس طرح تباہ کریں:

How to destroy their own leadership

میں نے کہا کہ ہر امت کا ایک آزمائشی پہلو ہوتا ہے، اور بدقسمتی سے ہر امت اسی آزمائش میں فیل ہوتی رہی ہے۔ نسل ابراہیم (بنی اسرائیل) کو اللہ نے منتخب کیا کہ ان کو تربیت دے کر ان کے ذریعہ عمومی شہادت کا کام لیا جائے۔ مگر عملاً یہ ہوا کہ ان کے اندر منتخب قوم (Chosen people) کا نظریہ پیدا ہوا اور داعی اور شاھد بننے کے بجائے وہ متکبر بن کر رہ گئے۔

یہودی زعم کو توڑنے کے لیے حضرت مسیح کو غیر معمولی معجزات دیے گئے، مگر ان کے پیروؤں نے یہ کیا کہ خود حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا بنا دیا۔ اور اس طرح توحید میں شرک کا عقیدہ شامل کر دیا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں آپ کے اصحاب کے ذریعہ یہ کام لیا گیا کہ قائم شدہ نظام جبر کو توڑا گیا تاکہ مذہبی آزادی کا ماحول پیدا ہو اور توحید کی دعوت کھلے ماحول میں جاری ہو سکے۔ اہل اسلام کے فوجی آپریشن کے ذریعہ یہ مقصد تو حاصل ہوا۔ مگر دوسرا نقصان یہ ہوا کہ مسلمانوں میں حاکمانہ نفسیات پیدا ہو گئی۔ اسی حاکمانہ نفسیات کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان کسی کی اطاعت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، الّا یہ کہ انھیں اس کے لیے مجبور کر دیا جائے۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ مغربی قوموں میں ہم دیکھتے ہیں کہ اتحاد ہے۔ اسی طرح ہندوؤں میں بھی اتحاد ہے۔ مگر مسلمانوں میں کہیں بھی اتحاد نہیں۔ آخر اس کا سبب کیا ہے۔

میں نے کہا کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ سچائی ایک ہے۔ اب ہر مسلمان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ "ایک" مجھے حاصل ہے۔ اس لیے وہ دوسرے سے لڑتا ہے، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ سچائی تو ایک ہی ہو سکتی تھی اور وہ مجھ کو حاصل ہو گئی۔ دوسرا جس چیز پر ہے وہ لازماً غلط ہے۔ کیونکہ سچائی ایک سے زیادہ ہو ہی نہیں سکتی۔

اس کے برعکس مغربی قوموں نے سیکولر نظریہ اختیار کر کے سرے سے اس بحث ہی کو ختم کر دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ مذہبی سچائی کا تصور ایک وہم ہے، اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اس طرح وہ اس نفسیاتی پیچیدگی ہی سے خالی ہو گئے ہیں جو دو فریقوں میں ٹکراؤ پیدا کرتی ہے۔
ہندوؤں کا معاملہ یہ ہے کہ انھوں نے یہ مان لیا کہ سچائی خواہ ایک ہو، مگر اس کے مظاہر

الگ الگ ہیں۔ اس نفسیات نے ان کے اندر یہ ذہن بنایا کہ اگر میں سچا ہوں تو دوسرا بھی سچائی کا حامل ہو سکتا ہے۔ یہ عقیدہ اپنے آپ اس شدت کو ختم کر دیتا ہے جو ٹکراؤ تک لے جاتی ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان میں بھی گہرا اتحاد قائم ہو سکتا ہے جیسا کہ دور اول میں قائم ہوا تھا۔ مگر اس اتحاد کی بنیاد ایک اور چیز میں ہے اور وہ تقویٰ ہے۔ مسلمانوں کو متحد رکھنے کی واحد طاقت تقویٰ ہے۔ اگر ان کے اندر فی الواقع خدا کا خوف موجود ہو تو یہ ان کے اتحاد کی ضمانت بن جائے گی۔ باعتبار عقیدہ اگرچہ وہ مانیں گے کہ سچائی ایک ہے۔ مگر جب اپنی ذات کا سوال ہو گا تو ان کو یہ اندیشہ لاحق ہو جائے گا کہ پتہ نہیں مجھ کو وہ واحد سچائی ملی یا نہیں۔ ان کو یہ ڈر لگا ہوا ہو گا کہ آخرت میں کہیں خدا یہ نہ کہہ دے کہ تم نے جس چیز کو سچائی سمجھ لیا وہ تمہارا وہم تھا نہ کہ حقیقی سچائی۔ یہ اندیشہ ناک نفسیات مسلمان کو تفرق سے بچاتی ہے۔ مگر جب یہ متقیانہ مزاج مسلمانوں میں باقی نہ رہے تو اس کے بعد وہی کچھ پیش آتا ہے جو موجودہ مسلمانوں میں دکھائی دے رہا ہے۔

نماز کے بارہ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ حضرت عمر فاروق کا قول ہے کہ الصَّلاۃُ عِمادُ الدِّین مَن اقامَہا اقامَ الدِّین ومَن ھدمَہا ھدمَ الدِّین (نماز دین کا ستون ہے۔ جس نے نماز کو قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا، اور جس نے نماز کو ڈھایا اس نے دین کو ڈھا دیا)

میں نے کہا کہ اس قول میں قائم کرنے اور ڈھانے کا تعلق کسی خارجی نظام سے نہیں ہے۔ اس کا تمام تر تعلق خود نمازی کی اپنی زندگی سے ہے۔ یعنی جو مسلمان فرد نماز کو اس کی صحیح اسپرٹ کے ساتھ ادا کرے گا اس کی زندگی میں نماز کی روح اتر جائے گی۔ اس کی پوری زندگی دینی رنگ میں رنگ جائے گی۔ اس کے برعکس جو شخص نماز کو اس کی صحیح اسپرٹ کے ساتھ ادا کرنے میں ناکام رہے گا، اس کی زندگی بھی اسلامی زندگی نہیں بن سکے گی۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ نے الرسالہ میں ڈائیکاٹمک تھنکنگ کو غلط بتایا ہے۔ یہ آپ کی اپنی بات ہے یا اس کا تعلق شریعت سے ہے۔ میں نے کہا کہ اس کا تعلق مکمل طور پر

شریعت سے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں بار بار اس کا نمونہ ملتا ہے۔

پھر میں نے کہا کہ حضرت عمر فاروق کا قول ہے کہ لیس العاقل الذی یعرف الخیر من الشر ولکنہ الذی یعرف خیر الشرین۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملات میں صرف دو پہلو (خیر یا شر) نہیں ہوتا۔ بلکہ اسی کے ساتھ ایک تیسرا پہلو خیر الشرین کا ہوتا ہے۔ جو آدمی صرف یہ جانتا ہو کہ معاملات میں ہمیشہ یا تو خیر کا پہلو ہوتا ہے یا شر کا پہلو، وہ ہمیشہ خیر کو حاصل کرنے کے نام پر شر سے ٹکراتا رہے گا، اور ساری قربانیوں کے باوجود عملاً کچھ بھی حاصل نہ کر سکے گا۔ کیوں کہ جس خیر کو حاصل کرنے کے نام پر قربانیاں دے رہا تھا وہ سرے سے قابل حصول ہی نہ تھا۔

اس قول میں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں بیشتر حالات میں چوائس خیر اور شر کے درمیان نہیں ہوتا بلکہ آدمی کے لیے ایک ایسی تیسری چیز کا چوائس ہوتا ہے جو بڑے شر کے مقابلہ میں چھوٹے شر کی حیثیت رکھتی ہو۔

امریکہ کے زمانۂ قیام میں ایک سے زیادہ بتانے والوں نے مجھے بتایا کہ یہاں اب یہ حال ہو چکا ہے کہ بیٹا ایک گرل فرینڈ لے کر گھر میں آتا ہے یا بیٹی ایک بوائے فرینڈ کے ساتھ گھر کے اندر داخل ہوتی ہے تو ماں باپ اس کو روک نہیں سکتے۔ حتی کہ اب ایسی مثالیں سامنے آرہی ہیں کہ باپ اپنی بیٹی سے کہتا ہے کہ تم کو ڈیٹنگ (dating) کرنا ہے تو کسی مسلمان لڑکے سے کرو، ہندو یا عیسائی لڑکے کے ساتھ مت کرو۔

ایک صاحب کے یہاں کھانا تھا۔ غالباً روٹی یا اور کوئی چیز نقصان کر گئی۔ میرا پیٹ کچھ خراب ہو گیا۔ میں نے دوسرے وقت کا کھانا چھوڑ دیا۔ میرے میزبان نے کھانے کے لیے کہا تو میں نے کہا کہ۔ اس کے علاج کا میرے پاس ایک سادہ نسخہ ہے، اور وہ ہے ـــ فاقہ سے افاقہ

امریکہ کے سفر میں کئی دن تک ایک صاحب کا ساتھ رہا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ اور اسلام اور مسلمانوں کے معاملہ میں مخلص بھی تھے۔ مگر ان کے اندر منفی طرز فکر اتنا زیادہ سما گیا تھا کہ وہ عجیب و غریب طور پر ہر واقعہ کو اپنے منفی سانچہ میں ڈھال لیتے تھے۔ جب میں کہتا کہ امریکہ میں مذہبی آزادی ہے تو فوراً وہ کچھ انکشافات بتا کر کہتے کہ یہ ظاہری آزادی حقیقت میں غلامی

سے بدتر ہے۔ اگر میں کہتا کہ امریکہ میں دعوت کے مواقع ہیں تو وہ فوراً بتاتے کہ یہ تو ایک گہری سازش ہے جو یہودی دماغ کی پیداوار ہے۔ چند دن کے تجربہ کے بعد میں نے انھیں ایک کاغذ لکھ کر دیا جس میں حسب ذیل الفاظ درج تھے :

You have a unique expertise of turning the positive into negative. In contrast, I always try to seek out the positive aspect among the most obviously negative circumstances.

۱۴ ستمبر کی شام کو محمد حسین صاحب کے ساتھ ماونٹ ہالی سے ٹرنٹن کے لیے روانگی ہوئی۔ ٹرنٹن کی مسجد میں ہم لوگ پہنچے تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ یہاں مغرب کی نماز کے بعد خطاب کا پروگرام تھا۔ یہ خطاب انگریزی میں ہوا۔ کیونکہ حاضرین زیادہ تر انگریزی داں تھے۔

میں نے اتحاد کے موضوع پر تقریر کی۔ میں نے کہا کہ اس مسجد میں اس وقت مختلف ملکوں کے لوگ موجود ہیں۔ انڈیا، پاکستان، بنگلہ دیش، عرب، مصر، وغیرہ۔ مگر تمام لوگوں نے مل کر ایک امام کے پیچھے نماز ادا کی۔ اس طرح نماز ہم کو اتحاد کا سبق دیتی ہے۔ نماز کا سبق یہ ہے کہ تم لوگ اپنے میں سے ایک کو امام بنا کر سب لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہو جاؤ۔ چنانچہ ایک کو چھوڑ کر تمام کے تمام لوگ بیک سیٹ پر چلے جاتے ہیں تب جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا ممکن ہوتا ہے۔ یہی سبق ہمیں مسجد کے باہر بھی دہرانا ہے۔ باہر کی زندگی میں بھی ہمیں یہی کرنا ہے کہ ایک کو لیڈر مان کر تمام لوگ اس کی ماتحتی قبول کرلیں۔ یہی اتحاد کا اصل راز ہے۔

ڈاکٹر سید اسد علی (نفسیاتی ڈاکٹر) سے مسجد میں ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں نے پوچھا کہ یہاں تمام شادیاں لو میریج کی بنیاد پر ہوتی ہیں، اس کے باوجود کیوں ایسا ہوتا ہے کہ پچاس فی صد سے زیادہ کیسوں میں طلاق ہو جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ زیادہ بڑی وجہ بوریت ہے۔ یہاں کے لوگوں کا نظریہ لذت ہے۔ چنانچہ ایک عرصہ کے بعد دونوں ایک دوسرے سے بور ہو جاتے ہیں اور پھر جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں، یہ جھگڑے تفریق تک پہنچ جاتے ہیں۔

دو آدمی بات کر رہے تھے۔ ایک صاحب کی آواز میرے کان میں آئی کہ انڈیا میں آپ خالص دودھ حاصل نہیں کر سکتے :

In India you cannot get pure milk.

میں نے سوچا کہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ انڈیا کی تصویر باہر کے ملکوں میں یہ ہے کہ وہاں ملاوٹ والا دودھ ملتا ہے۔ خالص دودھ وہاں پانا سخت مشکل ہے۔

۱۴ ستمبر ۱۹۹۶ کی شام کو کانفرنس سے فارغ ہو کر دوبارہ میں ماونٹ ہالی کی مسجد (اسلامک سوسائٹی) میں واپس آیا اور عشاء کی نماز کے بعد اوپر اپنے کمرہ میں جاکر لیٹ گیا۔ کچھ دیر کے بعد دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ اٹھ کر کھولا تو ایک نوجوان کھڑے ہوئے نظر آئے۔ یہ ایک ترک نوجوان تھے۔ انھوں نے مجھے ایک عربی کتاب دی۔ یہ ۱۹۲ صفحہ کی کتاب تھی۔ اس کا نام تھا: الخلافۃ والخلیفۃ۔ یہ کتاب اصلاً ترکی میں لکھی گئی تھی۔ موجودہ کتاب اسی کا عربی ترجمہ ہے۔

اس کے صفحہ اول پر لکھا ہوا تھا: منشورات دولۃ الخلافۃ۔ اس کتاب میں "امیر المومنین وخلیفۃ المسلمین" کا تعارف تھا۔ ان کا نام جمال الدین بن رشید خوجا اوغلو قابلان ہے۔ وہ ترکی کے ایک گاؤں دانگیس (Dangis) میں ۱۹۲۶ میں پیدا ہوئے۔ ۱۵ مئی ۱۹۹۵ کو جرمنی میں ان کا انتقال ہوا۔ اب ان کے صاحبزادے محمد متین بن جمال الدین خوجا اوغلو قابلان ان کی جگہ پر امیر المومنین وخلیفۃ المسلمین ہیں۔ ترکی یا اور کسی مسلم ملک میں وہ اپنی تحریک نہیں چلا سکتے تھے اس لیے وہ جرمنی میں مقیم ہیں:

Nousser Street 418, 50733 Koln, Germany
Tel. (0221) 976553-0

اس طرح دولۃ الخلافۃ اور امیر المومنین وخلیفۃ المسلمین کی تحریک چلانا جنون کی حد تک بے معنی ہے۔ پھر یہ مجنونانہ تصور کیسے پیدا ہوا۔ اس کا سبب ثنائی طرز فکر (dichotomous thinking) ہے جس میں آج امت کے بے شمار لوگ گرفتار ہیں۔ چنانچہ کتاب کے صفحہ ۶ پر النظامان کے عنوان کے تحت لکھا ہوا ہے کہ دنیا میں صرف دو نظام ہیں۔ ایک حق ہے اور دوسرا باطل۔ یعنی شرعی نظام حق ہے اور اس کے سوا دوسرے تمام نظام باطل ہیں (واحد منہا حق والآخر باطل۔ یعنی ان نظام الشریعۃ حق وما بقی من سائر الانظمۃ کلھا باطلۃ)

اس دو قسمی طرز فکر کی بنا پر یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ چونکہ شرعی نظام کہیں قائم نہیں ہے۔ اس لیے ساری دنیا سے لڑو تاکہ دوبارہ شرعی نظام قائم ہو۔ ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ عمل کی ایک تیسری صورت بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ ملے ہوئے مواقع کو استعمال کرکے مسلمانوں کو تعلیم یافتہ بنائیں۔ ان کے اخلاق کو درست کریں۔ غیر مسلم قوموں میں توحید اور آخرت کا پیغام پہنچائیں۔

جناب کلیم الدین صاحب الرسالہ کی مطبوعات اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ انھوں نے انگریزی کتابوں کا ایک سیٹ فلاڈلفیا کے اس ادارہ باوامحی الدین فیلوشپ (Tel. 215-8796300) کو دیا۔ ان لوگوں نے بھی اپنی مطبوعات کا ایک سیٹ ہم کو دیا۔ ان کے نام یہ ہیں :

1. Who is God? pp. 10
2. A book of God's Love, pp. 116.
3. Islam and World Peace: Explanations of a Sufi, pp. 164.
4. Treasures of Wisdom, pp. 18.
5. The Golden Words of a Sufi Sheik, pp. 488.

صوفی اسلام اہل مغرب کو بہت اپیل کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فلسفیانہ تصورات سے بہت قریب ہے۔ بلیشتر فلاسفہ حقائق کو ایک وحدت کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ اور تصوف کسی نہ کسی طور پر وحدت الوجود کا قائل ہے۔ اس طرح دونوں میں ایک یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ "گولڈن ورڈز" میں باوامحی الدین کے نقطۂ نظر کو انگریزی میں اس طرح بیان کیا گیا تھا :

God is within man and man is within God.

۱۴ ستمبر کی صبح کو فجر کی نماز میں امام صاحب نے سورہ الم نشرح پڑھائی۔ اس تقریب سے میں نے انّ مع العسر یسراً کی تشریح کی —— پرابلم کے ساتھ مواقع۔

حاضرین میں ڈاکٹر سلیمان افریقی بھی تھے جو ہوورڈ یونی ورسٹی (واشنگٹن) میں پروفیسر ہیں۔ انھوں نے مکمل اتفاق کیا۔

چائے پر کچھ دیر تک مزید نشست ہوئی۔ تقریباً ۱۰ آدمی تھے۔ دوبارہ اسلامی مضمون پر گفتگو ہوتی رہی۔ ۹ بجے صبح ہم لوگ یہاں سے روانہ ہوئے۔ ساتھ میں کلیم الدین صاحب، عرفان انیس صاحب، بلال صاحب تھے۔ ماونٹ ہالی سے روانہ ہو کر ہم فلاڈلفیا پہنچے۔

۱۵ ستمبر کو ۱۰ بجے صبح کا وقت تھا جب ہم لوگ باوامحی الدین سنٹر (فلاڈلفیا) پہنچے۔ جب

ہم لوگ داخل ہو رہے تھے تو دو سفید فام مسلمان (محمد لطیف، محمد صالح) باہر آ رہے تھے۔ اس طرح کے بہت سے سفید فام امریکی ہیں جو باوا کی تبلیغ سے مسلمان ہو گئے۔ آج اتوار تھا اس لیے بہت سے عورت مرد یہاں موجود تھے۔ یہ سب نومسلم تھے۔ یہ ایک خوب صورت سنٹر ہے۔ اس کے اندر ایک خوب صورت آڈیٹوریم تھا۔ باوا محی الدین یہاں ہرے رنگ کی ایک کرسی پر بیٹھ کر صوفیانہ گیت گاتے تھے۔ اس کا ریکارڈ تیار کر لیا گیا تھا۔ وہ یہاں بجایا جا رہا تھا۔ یہ گیت تامل زبان میں ہوتا تھا۔ ساتھ ساتھ ایک خاتون اس کا انگریزی ترجمہ کرتی جا رہی تھی۔

یہاں ایک صاحب نے بتایا کہ باوا محی الدین لنکا کے کسی جنگل سے آئے۔ گیت بہت پرنغمہ بھی تھا اور پر درد بھی۔ میرا قیاس تھا کہ ان کے یہ گیت جس میں نغمہ بھی تھا، درد بھی اور روحانیت بھی، اس کی خوش کن آواز یہاں کے سفید فام امریکن کو متاثر کرتی تھی۔ کیونکہ یہ لوگ بہت اثر پذیر طبیعت کے حامل ہوتے ہیں۔ ابتداءً اس سے متاثر ہوئے اور پھر اسلام کا مزید مطالعہ کر کے اسلام میں داخل ہو گئے۔

باوا مرکز کے اوپر کے حصہ میں ایک خوب صورت مسجد ہے۔ یہ مستقل تعمیر نہیں ہے بلکہ مختلف مکانوں کو خرید کر ان کے مجموعہ سے ایک مرکز بنا لیا گیا ہے۔ مسجد کے مؤذن عبداللہ نام کے افغانی تھے۔ میں نے کہا "افغانستان ایک خوب صورت ملک ہے۔" عبداللہ صاحب نے ایک آہ بھر کر کہا۔ ہاں وہ تھا (It was)

باوا محی الدین سنٹر پورا کا پورا نہایت منظم اور نہایت صاف ستھرا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان سے سفید فام لوگ متاثر ہوں۔

باوا محی الدین سنٹر کے باہر ایک بورڈ پر خوب صورت حروف میں لکھا ہوا ہے ——— صبر کے سمندر میں موجیں نہیں :

"The Ocean of Patience has no waves."

پہلے خاموش پرامن تبلیغ کی۔ جب حلقہ بن گیا، اس کے بعد مسجد بنائی خوب صورت مسجد۔ مسجد کے باہر ایک کتبہ لکھا ہے کہ مسجد کی تکمیل اور افتتاح ۲۷ مئی ۱۹۸۴ کو ہوا۔

امریکہ کے زمانۂ قیام میں ایک بار میں نے ایک سفید فام امریکن سے کشمیر کے بارے میں

سوال کیا۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ کشمیر کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ اس نے کہا کہ ہاں۔ وہ ابھی تک بری حالت میں ہے۔ ان کو ہماری مدد کی ضرورت ہے :

Q. Do you know about Kashmir?
A. Yes, I know it is in pretty bad shape and right now they need our help.

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ باہر کی دنیا میں ہندستان کی خارجہ پالیسی کتنا زیادہ ناکام ہے۔ میں نے کہا کہ آپ جیسے لوگ کشمیر کے بارہ میں صرف وہی جانتے ہیں جو میڈیا میں آتا ہے۔ اور میڈیا ہمیشہ سلکٹیو رپورٹنگ کرتا ہے۔ اگر آپ کشمیر کی پوری صورت حال کو جانیں تو آپ کی رائے بدل جائے گی۔

اسکول کے خوب صورت ہال میں ۱۴ اسمبر کو گیارہ بجے کانفرنس کی کارروائی شروع ہوئی۔ پہلے سیشن کا چیرمین مجھ کو بنایا گیا تھا۔ کوآرڈی نیٹر کے فرائض ایک بلیک مسلم مسٹر رسول سلوکی نے انجام دیا۔ تلاوتِ قرآن کے بعد مولانا ذکی الدین شرفی نے کانفرنس کا تعارف پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں مسلمان صرف اسپین تک پہنچے تھے۔ موجودہ زمانہ میں ایسے حالات پیدا ہوئے کہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کی بڑی تعداد مغربی ملکوں میں جمع ہوگئی۔ اس میں ایک خدائی منصوبہ دکھائی دیتا ہے۔ مولانا ذکی الدین شرفی نے کہا کہ ٹکراؤ دعوتی کام کے لیے زہر ہے :

Confrontational approach is a poison for Dawa.

اس کے بعد امام یحییٰ ہندی (فلسطین) نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے ان احادیث پر تفصیلی کلام کیا جو مسیح اور دجال سے متعلق کتب حدیث میں آئی ہیں۔ ان کے مقالہ کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ پیشین گوئیاں اتنی قطعی ہیں کہ ان کے استناد کے بارہ میں شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے بعد ڈاکٹر خالد یحییٰ بلینکن شپ نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ وہ ایک سفید فام نومسلم ہیں۔ انھوں نے ٹکنالوجیکل ڈولپمنٹ اور اس کے نتائج پر کلام کیا انھوں نے کہا کہ مادی تہذیب کا خلاصہ ہے Let us live comfortably ان کا پیپر لکھا ہوا تھا۔ مگر انھوں نے اس کو سامنے رکھ کر زیادہ تر زبانی کہا۔ عنوان یہ تھا :

The End of History and the last man.

نماز ظہر کے بعد کانفرنس کا دوسرا سیشن شروع ہوا۔ اس میں پہلا مقالہ باسط بلال کوشول کا تھا۔ اس کے بعد ساڑھے تین بجے میں نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر خالد کو میرے مقالہ سے کامل اتفاق ہوا۔ میں نے کہا تھا کہ مغربی تہذیب کو دجال کہنا شنائی طرز فکر کی بنا پر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں تیسری صورت یہ ہے کہ مغربی تہذیب نے سارے مواقع دعوت کھولے ہیں۔ یہ مقالہ ان شاء اللہ الرسالہ میں شائع کردیا جائے گا۔

باسط بلال کوشول کے مقالہ کا عنوان تھا —— اسلام اور مغربی تہذیب۔

ماونٹ ہالی کی مسجد میں ایک صاحب سے اسلام کی سیاسی تفسیر کے بارہ میں گفتگو ہوئی۔ انھوں نے بڑے جوش کے ساتھ یہ آیت پیش کی: ولا یشرك فی حکمه احدا (الکہف ۲۶) ان کے نزدیک اس آیت میں حکم کا مطلب سیاسی حکم تھا۔ اس طرح یہ آیت ان کے نزدیک اس مفہوم کے لیے صریح تھی کہ سیاسی حاکمیت میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ میں نے کہا کہ یہ ایک خود ساختہ مفہوم ہے۔ اور کسی بھی مفسر نے آیت کا یہ مطلب نہیں لیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں حکم سے مراد فوق الفطری حکم ہے نہ کہ سیاسی حکم۔ اس سے مراد کوئی قائم کیا جانے والا حکم نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ حکم ہے جو بالفعل کائنات میں قائم ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ زمین و آسمان کا نظام صرف ایک اللہ کے تحت ہے۔ کوئی بھی اس معاملہ میں اس کا شریک نہیں۔ ایسی حالت میں جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ کچھ اور شرکا رہیں جو زمین و آسمان کے نظام کو سنبھالنے یا اس کو چلانے میں اللہ کے شریک ہیں تو یہ ایک جھوٹ ہے۔ اس کے حق میں ان کے پاس کوئی دلیل موجود نہیں۔ اسی لیے آیت میں "وہ شریک نہیں کرتا" کا لفظ ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ "شریک نہ کیا جائے"۔

افتخار مدنی (۱۹۴۷) ۱۹۷۷ میں ایران میں تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ایران کا انقلاب ۵۰ فی صد خمینی کا کارنامہ ہے اور ۵۰ فی صد امریکہ کا۔ آیت اللہ خمینی کے کیسٹ پیرس سے ایران آتے تھے اور گھر گھر سنے جاتے تھے۔ ان کیسٹوں میں شاہ ایران کے خلاف جذبات بھڑکائے جاتے تھے۔ مگر شاہ کا جابرانہ نظام لوگوں کی زبان بند کیے ہوئے تھا۔ ستمبر میں اس وقت کے صدر امریکہ جمی کارٹر تہران گئے۔ انھوں نے شاہ ایران سے کہا کہ آپ کی حکومت لوگوں پر ظلم کر رہی ہے۔

آزادی ختم کردی ہے۔ شاہ ایران نے انکار کیا۔ گفتگو کے بعد شاہ نے کہا کہ کل آپ دیکھیں گے کہ اخبار، ٹی وی ہر جگہ لوگ آزادی کے ساتھ اظہار خیال کر رہے ہوں گے۔ چنانچہ اگلے دن عوامی آزادی کا اعلان کر دیا گیا۔ اس کے بعد اچانک ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ خمینی کے کیسٹوں نے جو اشتعال برپا کیا تھا وہ اچانک باہر آ گیا۔ یہاں تک کہ شاہ کو ملک چھوڑنا پڑا (شاہ حالات سے بے خبر تھا)

افتخار صاحب نے بتایا کہ شاہ کے جانے کے بعد کسی ایرانی نے ان سے کہا کہ کیا شاہ چلا گیا (شاہ رفت) انھوں نے کہا کہ ہاں۔ ایرانی نے کہا کہ نہیں، وہ بھاگ گیا (فرار کرد)

تقریر کے بعد بہت سے سوالات کیے گئے۔ ایک سوال یہ تھا:

Many people, including Muslims, think Islam was spread by force. What is your opinion.

میں نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ پچھلی تاریخ میں دوسری قوموں کے ساتھ لڑائیاں ہوئی ہیں۔ مسلمانوں کی حکومتیں بھی قائم ہوئی ہیں۔ مگر ان لڑائیوں یا ان حکومتوں کا اسلام کی تبلیغ واشاعت سے کوئی براہ راست تعلق نہ تھا۔ اسلام ہر جگہ، بشمول عرب، اپنی نظریاتی طاقت کے ذریعہ پھیلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصر میں اگرچہ دور اول کے مسلمانوں اور وہاں کے قدیم حکمرانوں سے جنگ ہوئی۔ مگر مورخین نے اعتراف کیا ہے کہ مصر میں مذہب اسلام کا پھیلنا تلوار کے زور پر نہیں ہوا بلکہ قرآن کے ذریعہ پر امن طور پر ہوا۔ مثلاً مصری تاریخ کے ماہر سر آرتھر کیتھ نے لکھا ہے:

The Egyptians were conquered not by the sword but by the Qur'an.

ایک صاحب بظاہر اچھی حالت میں دکھائی دیتے تھے۔ ان کے پاس اچھا جاب بھی ہے۔ ایک روز اپنے ذاتی حالات بتائے تو معلوم ہوا کہ وہ نہایت بری حالت میں ہیں۔ ان کو ایسا لگنے لگا تھا کہ ان کا مستقبل اب تباہ ہو چکا ہے۔ میں نے کہا کہ زندگی کے امکانات کبھی ختم نہیں ہوتے۔ ہر کھونے کے بعد پانے کا ایک نیا امکان آدمی کے لیے موجود رہتا ہے۔ کسی نے نہایت درست کہا ہے کہ آج کا دن میری بقیہ زندگی کے لیے پہلا دن ہے:

Today is the first day of the rest of my life.

میں نے کہا کہ آپ کھوئے ہوئے دنوں پر افسوس کرنے کے بجائے بقیہ دنوں کو بھرپور

طور پر استعمال کریں ۔

کانفرنس میں مختلف لوگ اپنا اپنا لٹریچر تقسیم کر رہے تھے۔ شاہد اطہر ایم ڈی کے نام سے چھپا ہوا ایک پمفلٹ ملا۔ یہ جمعہ کی تقریر تھی جو انھوں نے انڈیانا پولس (Indianapolis) کی الفجر مسجد میں کی تھی۔ انھوں نے قرآن کی روشنی میں داعی کے کیرکٹر کو بیان کیا تھا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کہا تھا کہ دعوت کے راستہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ سی آئی اے، امریکی حکومت یا مسیحی مشنریوں کی طرف سے نہیں ہیں، بلکہ وہ خود مسلمانوں کی طرف سے ہیں جو کہ اسلام کو اس کی اصل معنویت اور صحیح مثال کے ذریعہ پیش نہیں کر رہے ہیں :

> The obstacle to the efforts of Da'wah are not from the CIA, U.S. Government, or evangelists but from we Muslims, in not showing Islam in its true meaning and example.

امریکہ کی ریاست ورجینیا کے شہر پورٹس ماوتھ (Portsmouth) میں ۱۵ ستمبر ۱۹۹۶ کو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ دو مسلم خواتین کسی سامان کی خریداری کے لیے مقامی جنرل اسٹور کی طرف جا رہی تھیں۔ انھوں نے اپنے چہرہ پر مشرقی انداز کا پردہ ڈال رکھا تھا۔ فوراً پولیس آئی اور اس نے دونوں خواتین کو گرفتار کر لیا۔ ان کے ساتھ کسی قسم کی بدتمیزی نہیں کی گئی۔ البتہ انھیں پردہ اوڑھ کر چلنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

مسلم خاتون نے اپنی صفائی میں کہا کہ ہم دونوں مسلمان ہیں اور یہ ہمارے اسلامی لباس کا ایک حصہ ہے۔ پولیس نے اس دلیل کو نہیں مانا۔ اس نے کہا کہ ہمارے نزدیک یہ نقاب (mask) ہے اور امریکی قانون کے مطابق، کوئی مرد یا عورت کسی پبلک پلیس پر اپنے چہرہ کو نقاب میں چھپا کر نہیں چل سکتا۔

چونکہ مجرمین بعض اوقات اپنے کو شناخت سے بچانے کے لیے چہرہ پر نقاب (ماسک) ڈال لیتے ہیں۔ اس لیے امریکہ میں مذکورہ قانون بنایا گیا ہے ۔

عرفان انیس عمر صاحب ٹمپل یونی ورسٹی میں ریسرچ کر رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میں دہلی میں فلاسفی کا سبجکٹ لیے ہوئے تھا۔ اس وقت مذہب سے مجھے دل چسپی نہ تھی۔ پھر مجھے الرسالہ ملا۔ الرسالہ کے مطالعہ کے بعد مجھے اسلام کو پڑھنے سے دل چسپی ہوگئی۔ الرسالہ مجھے

۱۹۸۶ میں ملا تھا۔ اس کے بعد میں اسلام کا مطالعہ کرنے لگا۔ یہاں تک کہ میں ٹمپل یونیورسٹی کے مذہبی شعبہ میں پہنچ گیا۔

امریکہ میں مقیم ایک مسلم دانشور سے ملاقات ہوئی۔ امریکہ کی ایک یونی ورسٹی سے انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ اردو زبان بھی جانتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے الرسالہ (اگست ۱۹۹۶) پڑھا جو حریت فکر کے موضوع پر ہے۔ آپ نے ۵۰ صفحہ حریت فکر پر لکھا ہے، مگر اصل موضوع کو تو آپ نے چھوا ہی نہیں کیا۔ مجھے ان کے اس تبصرہ پر تعجب ہوا۔ میں نے پوچھا کہ وہ کیسے۔ انھوں نے کہا کہ امریکہ لامحدود آزادی کو مانتا ہے۔ آپ کو یہ بتانا تھا کہ آزادی کی حدود کیا ہیں۔ مگر اس اہم سوال پر آپ نے کلام ہی نہیں کیا۔

اس سے اس فارسی مقولہ کی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ یک مَن علم را دہ مَن عقل می باید (ایک مَن علم کے لیے دس مَن عقل چاہیے) مذکورہ دانشور کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے الرسالہ کے شمارہ کو غلط معیار سے ناپا۔ مذکورہ شمارہ کا موضوع اختلاف رائے ہے نہ کہ آزادیٔ فکر۔ وہ اسلامی معاشرہ میں حریت فکر کے مسئلہ سے بحث کرتا ہے۔ مغربی فلسفہ کے مطابق، انسانی آزادی کا مسئلہ اس کا موضوع نہیں۔ بالفاظ دیگر، الرسالہ کا مذکورہ شمارہ اس موضوع پر ہے کہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے مقابلہ میں اختلاف رائے کی کتنی آزادی ہے۔ انسان کو خدا و رسولؐ کے مقابلہ میں کتنی آزادی حاصل ہے، یہ مذکورہ شمارہ کا موضوع بحث ہی نہیں۔

ڈاکٹر سلیمان ناینگ (۵۲ سال) افریقہ میں پیدا ہوئے۔ آج کل وہ امریکہ (واشنگٹن) میں ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ارٹیریا کی آزادی کے باوجود وہاں کا مسئلہ حل نہیں ہوا۔ پہلے ان کی جنگ ایتھپیوں سے تھی اب آپس میں ہے۔ ایک طرف اسلام پسند طبقہ ہے اور دوسری طرف سیکولر مسلمان اور عیسائی ہیں۔ عیسائی اب بھی ارٹیریا میں تقریباً ۳۰ فی صد ہیں۔ اس طرح دونوں ملا کر اکثریت میں ہو جاتے ہیں اور یہی لوگ اس وقت ارٹیریا میں حکومت کر رہے ہیں۔ گویا جو لڑائی افغانستان میں ہے وہی ہر جگہ مختلف صورتوں میں جاری ہے۔

اس صورت حال کی تمام تر ذمہ داری اسلام پسند طبقہ پر ہے۔ سلیمان نایَنگ (Dr. Sulayman Nayang) واشنگٹن سے آئے تھے۔ وہ گامبیا میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کی تکمیل

کے بعد اب وہ واشنگٹن کی ہوورڈ یونی ورسٹی میں اسلامیات کے استاد ہیں۔ امریکہ میں ہارورڈ یونیورسٹی سفید فام لوگوں کی یونی ورسٹی سمجھی جاتی ہے اور ہوورڈ یونی ورسٹی سیاہ فام لوگوں کی یونی ورسٹی۔

کانفرنس میں ایک صاحب نے پرجوش تقریر کی۔ جس میں امریکی نظام کے خلاف نہ صرف شکایت کا اظہار تھا بلکہ وہ امریکی نظام کے خلاف تشدد کی دعوت دے رہا تھا۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ یہ باتیں تو مجھے پاگل پن کی حد تک بے معنی نظر آتی ہیں۔ پھر اس قسم کے لوگ کیوں امریکہ میں رہتے ہیں اور بچوں کو یہاں لاکر بساتے ہیں۔

انھوں نے مذکورہ مقرر کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں نہایت نرم مزاج (compassionate) ہیں۔ اپنے ذاتی کردار میں وہ لوگوں کے ساتھ نہایت نرمی کا معاملہ کرتے ہیں۔ یہ بات انھوں نے مقرر کی تعریف میں کہی تھی۔ مگر میرے نزدیک یہ ڈبل اسٹینڈرڈ کی مثال ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ مقرر اپنے ذاتی معاملہ میں تو موافقت اور ایڈجسٹمنٹ کی پالیسی اختیار کیے ہوئے ہے۔ اور اسٹیج پر آکر دوسروں کو ٹکراؤ کے راستہ پر جانے کا سبق دے رہے ہیں۔ یہ اس حدیث کی کھلی خلاف ورزی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ دوسروں کے لیے بھی وہی پسند کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو۔

اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے میں نے کہا کہ دجال کون ہے، اور کون نہیں ہے، یہ ایک استنباطی مسئلہ ہے۔ اور استنباطی معاملہ میں کوئی بھی حتمی طور پر کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔ اس طرح کے معاملہ میں امام شافعیؒ کا قول نہایت درست ہے کہ: رأیی صواب یحتمل الخطا ورأی غیری خطأ یحتمل الصواب:

My opinion is correct, with the possibility of error, inasmuch as the other opinion is wrong with the possibility of being correct.

ڈاکٹر خالد یحییٰ بلینکن شپ نے ۱۹۷۳ میں اسلام قبول کیا۔ کانفرنس میں ان سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا کہ آپ نے کس طرح اسلام قبول کیا۔ اس کے جواب میں انھوں نے جو سطریں لکھ کر دیں وہ یہاں نقل کی جاتی ہیں:

I embraced Islam because I was always convinced that Allah (God) exists, created me, and is worthy of worship. I found that message proclaimed most clearly and perfectly in Islam. There is no confusion or unnecessary decoration in Islam, there is no deity except Allah; it is so simple. Also, I found that the historical basis of Islam was sound. Here was a message from Allah, the Qur'an, in the original Semitic language, the Arabic, the inheritor of 4000 years of monotheistic religious concepts in earlier Semitic languages brought by earlier prophets. Also, the i'jaz (miraculous "style") of the Qur'an. I decided to embrace Islam after reading Surah 49 in Arabic, when I perceived that this was indeed the truth.—Khalid Yahya Blankinship, born Seattle, Washington State, USA, 11 Jan 1949/10 Rabi' al-Awwal 1368.

ڈاکٹر خالد نے کہا کہ اسلام کے دعوتی امکانات بے پناہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہر انسان امکانی طور پر مسلمان ہے:

Every human being is potentially Muslim.

کانفرنس جس اسکول میں ہوئی وہ غیر معمولی طور پر بڑا تھا۔ وہ اپنی وسعت کے اعتبار سے ایک یونی ورسٹی معلوم ہوتا تھا۔ غیر معمولی طور پر بڑے پارک، عمدہ سڑکیں، مرصع عمارتیں، ہر قسم کے تعلیمی انتظامات وہاں نہایت اعلیٰ درجہ میں موجود تھے۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ آپ لوگ کہتے ہیں کہ یہ لوگ دجال ہیں۔ اگر یہ دجال ہیں تو ہم کو ایسے دجال اور چاہئیں جو انسان کو تعلیم یافتہ بنائیں۔ کیوں کہ اسلام ایک اعلیٰ درجہ کا سائنٹفک مذہب ہے۔ چنانچہ غیر تعلیم یافتہ انسان اور اسلام کے درمیان ایک قسم کا انٹلکچول گیپ موجود رہتا ہے۔ تعلیم اس گیپ کو ختم کرتی ہے۔ یہ دجال ہمارا پچاس فی صد کام کر رہے ہیں۔ اب ہمیں یہ کرنا ہے کہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے بقیہ پچاس فی صد والا کام کرنے میں لگ جائیں۔

مسٹر کوکب صدیقی نے ایک دھواں دھار تقریر کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ —— میں نے امریکہ کا تفصیلی سفر کیا۔ یہاں کی مسجدیں دیکھیں۔ بڑی تعداد میں لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ یہاں کے مسلمان خوش ہیں۔ مگر کیا یہ مسجدیں کافی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ امریکہ میں مذہبی آزادی ہے۔ مگر کفار کی دی ہوئی اس مذہبی آزادی کی حقیقت کیا ہے۔ وہ محض نمائشی آزادی ہے۔ ھم شھداء اللہ فی الارض ہیں۔ اس ملک کے پبلک (عوام) مسلمانوں کے خلاف نہیں ہیں۔ مگر

پاور اسٹرکچر میں جو لوگ ہیں وہ مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ یہ سب سیاسی شیطان ہیں۔ یہ لوگ دشمنان اسلام (enemies of Islam) ہیں۔ امریکی گورنمنٹ کو صہیونی کنٹرول کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھ ہمارے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔

یہ سب باتیں مجنونانہ حد تک بے معنی ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ امریکہ میں بسنے والے اکثر مسلمان اسی طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ انھیں اس کا احساس نہیں کہ اگر فی الواقع امریکہ ویسا ہی برا ہے جیسا کہ وہ بتاتے ہیں تو آخر وہ اپنے کو اور اپنی نسلوں کو کس خانہ میں ڈالیں گے جو اسی امریکی مشین کا پرزہ بنے ہوئے ہیں۔

کانفرنس کے موقع پر کناڈا کے مسلم میگزین کریسنٹ (Tel. 416-4749293) کی طرف سے ایک فلائر تقسیم کیا گیا۔ یہ دراصل ۱-۱۵ ستمبر ۱۹۹۶ کا اڈیٹوریل تھا۔ جس کا عنوان تھا :

American politicians get hysterical.

اس میں شکایت کی گئی تھی کہ کمیونزم کے سقوط کے بعد اسلام کو یہ کہہ کر نشانہ بنایا جارہا ہے کہ وہ مغرب کا دشمن نمبر ایک ہے۔ اسلامک ایکٹوزم کو وحشیانہ روپ میں دکھایا جارہا ہے۔ مشکل سے کوئی ایسا دن گزرتا ہے جب کہ مسلمانوں کی بلاسبب توہین نہ کی جاتی ہو :

Islamic activism is demonized. Hardly a day passes by without some gratuitous insult being hurled at the Muslims.

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ دیکھئے، اس جملہ میں اسلام اور مسلمان کو ہم معنی الفاظ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان جو کچھ کریں وہ اپنے آپ اسلامی بن جاتا ہے۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی سرگرمیوں کو اسلامک ایکٹوزم بتایا گیا ہے۔ حالانکہ یہ تمام سرگرمیاں بلاشبہ قومی ایکٹوزم ہیں نہ کہ حقیقۃً اسلامک ایکٹوزم۔

یہ ایک جرم ہے جس کو موجودہ زمانہ کے مسلم دانشور مسلسل انجام دے رہے ہیں۔ اس غلط روش نے موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کا ہر فعل اسلام کی طرف منسوب ہو کر اسلام کی بدنامی کا سبب بن رہا ہے۔

۱۵ ستمبر کی شام کو مغرب کی نماز کی مسجد (بروکلین) میں پڑھی۔ یہاں محمد سلیم رانا صاحب سے

کی مسجد میں ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ کو پاکستان. کا مخالف بتایا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ سراسر بے بنیاد بات ہے، اور یہ میرے اوپر بہتان ہے۔ میرا اختلاف صرف اس معاملہ میں ہے کہ پاکستان کی تعمیر کے لیے عملی طریقہ کیا ہو۔ میں ان لوگوں کا مخالف ہوں جو پاکستان بنتے ہی یہ پُر شور مطالبہ لے کر کھڑے ہو گئے کہ پاکستان میں اسلامی قانون نافذ کرو۔ میں کہتا ہوں کہ یہ احمقانہ حد تک بے معنی تحریک تھی۔ کیونکہ مطالباتی ہنگاموں سے کبھی کسی ملک میں اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ میرا کہنا یہ تھا کہ سیاسی اقتدار کے معاملہ کو الکشن پر اس کے حوالے کرکے ان لوگوں کو اصلاح معاشرہ کے کام پر لگنا چاہیے تھا۔ یہ لوگ اگر ریاست کے اسلامائزیشن کے بجائے انسان کے اسلامائزیشن پر اپنی کوششوں کو مرتکز کرتے تو اب تک بہت کچھ کام ہو چکا ہوتا۔ مگر گھوڑا کے آگے گاڑی باندھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری کوششیں برباد ہو کر رہ گئیں۔

نماز کے بعد بڑی تعداد میں لوگ ٹھہر گئے۔ میں نے ۵۰ منٹ تک خطاب کیا۔ خطاب کا موضوع اعتماد علی اللہ اور صبر و اعراض تھا۔

امریکہ میں مقیم ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے ایک گفتگو کے دوران کہا کہ اگر آپ اسلام میں امن کی بات کریں تو لوگ تعجب کے ساتھ سوال کریں گے کہ کیا آپ صوفی ہیں :

When you speak of peace in Islam, some people surprisingly ask, "are you a Sufi?"

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے پایا ہے کہ مسلمانوں میں صوفی لوگ ہی ہیں جو حقیقی معنوں میں امن کی بات کرتے ہیں۔ جو دوسروں کے درمیان پر امن طور پر رہ کر روحانی ترقی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ اس کے برعکس جو دوسرے مسلمان ہیں وہ یا تو عملاً جہاد کے نام پر ٹکراؤ کی تحریک چلا رہے ہیں۔ یا لفظی طور پر اسلام کا ایسا تصور پیش کرتے ہیں جو لا محالہ ایک اور دوسرے کے درمیان ٹکراؤ پیدا کرنے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں صوفی اسلام زیادہ مقبول ہوا ہے۔ اس کے مقابلہ میں انقلابی اسلام کو لوگ ایسی نظر سے دیکھتے ہیں جیسے کہ وہ دور تہذیب سے پہلے کا کوئی مذہب ہو، جب کہ لڑنا بھڑنا زندگی کا ایک حصہ بنا ہوا تھا۔

۱۶ ستمبر ۱۹۹۶ کو واپسی تھی۔ صبح سات بجے جناب خواجہ کلیم الدین صاحب کے ساتھ بروکلین سے کینیڈی ایرپورٹ کے لیے روانہ ہوا۔ ایرپورٹ کے مختلف مراحل طے ہوکر آخر کار گیٹ نمبر ۳ تک پہنچا۔ کلیم الدین صاحب آخری مرحلہ تک میرے ساتھ رہے۔ دہلی ایرپورٹ پر ایسا ہونا ممکن نہیں۔ یہاں پہنچانے والے کو بیرونی گیٹ پر روک دیتے ہیں۔ اس کے آگے صرف ٹکٹ کے حاملین ہی جاسکتے ہیں۔

نیویارک سے لندن کے لیے برٹش ایرویز کی فلائٹ نمبر ۱۷۸ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ ساڑھے چھ گھنٹہ کی یہ پرواز اٹلانٹک سمندر کے اوپر تھی اور نہایت اسموتھ تھی۔ مگر لندن کے ہیتھرو ایرپورٹ پر جہاز اترا تو ایسا محسوس ہوا جیسے کہ وہ دھم سے گرگیا ہو۔ میں ڈرا کہ کہیں پہیہ پھٹ تو نہیں گیا۔ مگر خدا کے فضل سے کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔

لندن سے دہلی کے لیے برٹش ایرویز کی فلائٹ ۱۴۵ کے ذریعہ ہوئی۔ اس فلائٹ میں ہندستانی زیادہ تھے۔ اس لیے حسب دستور شور کا اضافہ ہوگیا۔ ہندستانی مزاج نہ چپ رہنے کا ہے اور نہ آہستہ بولنے کا۔ ایک ہندستانی پابند رویہ صرف اس وقت اختیار کرتا ہے جب کہ وہ اس کے لیے مجبور کردیا گیا ہو۔ اصول کے تحت آزادانہ طور پر ہندستانی کے لیے پابند زندگی گزارنا ممکن نہیں۔

یہ جہاز دہلی ہوتا ہوا ڈھاکہ جارہا ہے۔ چنانچہ اس میں اعلانات انگریزی کے بعد ہندی اور بنگلہ زبان میں ہوئے۔ بنگلہ زبان میں اعلان مرد نے کیا اور اس کا آغاز السلام علیکم سے کیا اور آخر میں خدا حافظ کہا۔ پاکستان اور بنگلہ دیش بننے کا کوئی حقیقی اسلامی فائدہ تو نہیں ہوا۔ البتہ کچھ نہ کچھ کلچرل تشخصات ضرور قائم ہوگئے ہیں۔

۱۷ ستمبر ۱۹۹۶ کو دوپہر کے وقت جہاز دہلی ایرپورٹ پر اترگیا۔ نیویارک سے لندن کی پرواز بہت ہموار تھی۔ مگر لینڈنگ غیر ہموار رہی۔ اس کے برعکس لندن سے دہلی کی پرواز غیر ہموار تھی مگر لینڈنگ بالکل ہموار تھی۔ یہی وسیع تر معنوں میں زندگی کا معاملہ ہے۔ کبھی آدمی کا ایک پہلو درست ہوتا ہے اور کبھی دوسرا پہلو۔ موجودہ دنیا میں ہر پہلو سے معیاری زندگی حاصل کرنا ممکن نہیں۔

سوال

میں نے آپ کی کتابیں پڑھی ہیں۔ آپ کا ماہانہ رسالہ بھی دیکھتا ہوں۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ مسلم اکابر کو ہدف تنقید کیوں بناتے ہیں۔ آپ اس کے بغیر بھی اپنی بات کہہ سکتے ہیں۔ آپ جب مسلم اکابر کا نام لے کر ان کو ہدف تنقید بناتے ہیں تو اس سے قاری کے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ اس قسم کی تنقید کا فائدہ سمجھ میں نہیں آتا۔ (خالد ندوی)

جواب

آپ کی یہ شکایت دراصل ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ آپ اس قسم کی تحریروں کی بابت یہ سمجھتے ہیں کہ ان میں کچھ شخصیتوں کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔ حالانکہ اصل بات یہ نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ میرا مقصد ۲۰ ویں صدی کے ایک انوکھے ظاہرہ (Phenomenon) کی توجیہہ ہوتا ہے۔ اس ظاہرہ کے ساتھ چونکہ بہت سی شخصیتوں کے نام وابستہ ہیں۔ اس لئے ان کے نام کا حوالہ بھی ضمناً ان تحریروں میں آجاتا ہے۔ وہ انوکھا ظاہرہ یہ ہے کہ ۲۰ ویں صدی میں اسلام کے نام پر بہت بڑی بڑی کوششیں اور قربانیاں سامنے آئیں۔ مگر ان کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔ میں تاریخ اسلام کے اس انوکھے ظاہرہ کی توجیہہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں ضمنی طور پر کچھ شخصیتوں کے نام بھی آجاتے ہیں۔ اس کا مقصد کسی شخصیت کو الزام دینا نہیں ہوتا بلکہ ایک تاریخی ظاہرہ کی توجیہہ تلاش کرنا ہوتا ہے۔ آپ جیسے لوگ اگر اس فرق کو سامنے رکھ کر مطالعہ کریں تو آپ کو میری ان تحریروں سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔

سوال

ہندوستان میں ہندو مسلم مسئلہ بہت پرانا ہے۔ وہ ۱۹۴۷ سے پہلے بھی تھا اور ۱۹۴۷ کے بعد بھی باقی ہے۔ آپ کے نزدیک اس مسئلہ کی جڑ کیا ہے اور اس کا حل کیا ہے۔ آپ اس مسئلہ کا ذمہ دار کس کو سمجھتے ہیں۔ (نصیر احمد، سہرسا)

جواب

میرے نزدیک یہ ففٹی ففٹی کا معاملہ ہے۔ یعنی اس معاملہ کی پچاس فیصد ذمہ داری ہندوؤں پر ہے اور پچاس فیصد ذمہ داری مسلمانوں پر۔ ہندوؤں کی غلطی کی جڑ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو "غیر" کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ ہندوستانی مسلمانوں کی ۹۹ فیصد تعداد خود ہندوؤں سے ہی نکل کر آئی ہے۔ ہندوؤں کا کہنا ہے کہ سارے مذاہب ایک ہیں اور تمام مذاہب سچے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر کچھ ہندوؤں نے ہندو مذہب کو چھوڑ کر اسلام کو اختیار کر لیا تو ہندو عقیدہ کے مطابق، وہ ایک سچے مذہب کو چھوڑ کر دوسرے سچے مذہب میں داخل ہو گیا۔ ایسی حالت میں کم از کم ہندوؤں کو ہرگز اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہئے اور نہ ایسے مسلمانوں کو غیر سمجھنا چاہئے۔ مسلمانوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ قدیم ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کو "اسلامی حکمراں" قرار دیتے ہیں اور ان کا دفاع اسی طرح کرتے ہیں جس طرح انھیں اسلام کا دفاع کرنا چاہئے۔ چونکہ ہندو ان حکمرانوں کو حملہ آور سمجھتے ہیں اس لئے جب مسلمان ان کی حمایت کرتے ہیں تو ہندوؤں کو ایسے مسلمانوں سے بھی شکایت ہو جاتی ہے۔ میرے نزدیک دونوں ہی طرف یہ صرف سوچ کی ایک غلطی کا معاملہ ہے، وہ کوئی حقیقی مسئلہ نہیں۔

سوال

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا کوئی قائد نہیں۔ ایسا کیوں ہے۔ آپ کے خیال میں اگر کوئی قائد ہے تو وہ کون ہے۔ اگر کوئی قائد نہیں ہے تو اس کا سبب کیا ہے۔ آخر مسلم ملت قیادت سے خالی کیوں ہو رہی ہے۔ (نسیم احمد اعظمی، مئو)

جواب

یہ سوال بہت زیادہ دہرایا جاتا ہے۔ مگر میرے نزدیک وہ درست نہیں ہے۔ میں سمجھتا

ہوں کہ مسلمانوں کا مسئلہ فقدان قیادت نہیں ہے، بلکہ ان کا اصل مسئلہ فقدان قبولیتِ قیادت ہے۔ ایک ہندی مثل ہے کہ مانو تو دیو، نہیں تو پتھر۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی اہل ہو، وہ خود سے اپنی قوم کا قائد نہیں بن جاتا۔ بلکہ وہ قوم کے قبول کرنے سے قائد بنتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مسٹر محمد علی جناح دونوں ہم عصر تھے۔ تقریباً بلا اختلاف یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے اندر قیادت کی اعلیٰ صلاحیت موجود تھی۔ امکانی طور پر مسٹر محمد علی جناح سے زیادہ بڑے قائد تھے۔ مگر اس زمانے کے مسلمانوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کو بحیثیت قائد کے قبول نہیں کیا۔ اس کے مقابلہ میں مسٹر محمد علی جناح کو مسلمانوں کے درمیان غیر معمولی مقبولیت ملی۔ چنانچہ اس زمانے کے مسلمانوں کے درمیان مسٹر محمد علی جناح قائد اعظم بن گئے اور مولانا ابوالکلام آزاد صرف شو بوائے بن کر رہ گئے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کا یہی مزاج آج بھی باقی ہے۔ وہ اہل افراد کو اپنا رہنما بنانے میں ناکام رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اہل افراد پیدا ہو کر مر جاتے ہیں اور وہ قیادت کے میدان میں اپنے فرائض ادا نہیں کرپاتے۔

مطبوعات مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی

مراٹھی آموز	ڈکٹر عصمت جاوید	۲۵ روپے
ایک ہی پیالہ (ڈرامہ)	رام گنیش گڑکری مراٹھی سے ترجمہ خلیل مظفر	۲۰ روپے
ناگپور میں اردو	ڈاکٹر شرف الدین ساحل	۵۰ روپے
علم الامراض	ڈاکٹر کرنل محمد غفران	۹۰ روپے
چاند تارے	اسحاق خضر	۱۵ روپے
کمپیوٹر اور اس کی بیسک زبان	عبدالباری مومن	۲۰ روپے
تصور شکست کار	بی آر دیودھرم مراٹھی سے ترجمہ دستگیر شہاب	۲۵ روپے
امکان مراٹھی عصری ادب کا انتخاب (اردو)		۴۰ روپے
امکان مراٹھی عصری ادب کا انتخاب (اردو)		۲۵ روپے
امکان یک بابی ڈرامہ (خصوصی شمارہ)		۱۰ روپے
امکان سراج اورنگ آبادی (خصوصی شمارہ)		۲۰ روپے

ملنے کے پتے: (۱) مہاراشٹر اردو اکادمی، فون: ۲۶۷۲۷۰۳
اولڈ کسٹم ہاؤس، ڈی ڈی بلڈنگ، شہید بھگت سنگھ مارگ، ممبئی ۴۰۰۰۲۳
(۲) مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، پرنس بلڈنگ، جے جے اسپتال، ممبئی ۴۰۰۰۰۸

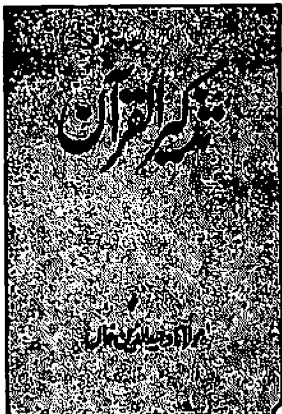

تذکیر القرآن

نئی طباعت
ایک جلد میں مکمل

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکزِ توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہمِ قرآن کی کنجی ہے۔

نصف رعایت

ہدیہ : 400 روپے

1600 صفحات، باریک کاغذ پر ایک جلد میں مکمل۔

مساجد اور لائبریری وغیرہ میں تقسیم کرنے کے لئے 5 کاپیاں یا اس سے زیادہ تعداد منگوانے پر

نصف رعایت کے ساتھ صرف 200 روپے میں دستیاب ہے

5 کاپیاں یا اس سے زیادہ تعداد منگوانے پر ڈاک خرچ بھی ادارہ کے ذمہ ہوگا۔

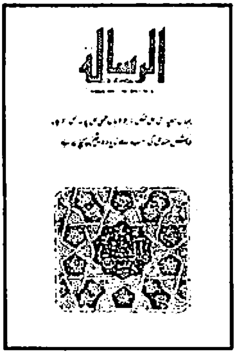

مصنف کی تحریریں مسلسل پڑھنے کے لئے
ماہنامہ الرسالہ کا مطالعہ کیجئے

اسلام کی فطری دعوت اور اس کے ابدی
پیغام کو جدید اسلوب میں سمجھنے کے لئے
الرسالہ اپنی نوعیت کا واحد جریدہ ہے

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in

Finest collection of books on Islam

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, Near DVB, New Delhi-110 013
Tel. 4611128, 4611131, Fax 4697333
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in, Web: http://www.alrisala.org

Delhi Postal Regd. No. DL/11154/98